قیمت پانچ روپے

حضرت بل میں وحشیانہ قتل

انٹرنیشنل

ملی ٹائمز

نئی دہلی

اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

اس شمارے میں

ملت کی پشت میں چھرا گھونپ کر مسلم ووٹ کا سودا

کیا خالدہ ضیاء کو پھانسی ہوگی؟

Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	60p.
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	$1.25

کیا بی جے پی مشرقی اترپردیش میں فساد کرانے کی سازش کر رہی ہے

سماج وادی لیڈروں کی ہلاکت انتخابی تشدد کا پیش خیمہ بن سکتی ہے

کیا بی جے پی الیکشن کے موقع پر اترپردیش بالخصوص مشرقی اترپردیش میں فرقہ وارانہ فساد کرانا چاہتی ہے تاکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشیدہ صورت حال کے دوش پر بیٹھ کر انتخابی کامیابی حاصل کرے؟ یہ سوال حال ہی میں گورکھپور کے پاس بانس گاؤں میں سماجوادی پارٹی کے لیڈروں پر بم سے حملے اور ۹ افراد کی ہلاکت کے بعد اٹھ رہا ہے۔ اس دھماکہ میں سماج وادی پارٹی کے ریاستی سکریٹری اور سابق ممبر اسمبلی اوم پرکاش پاسوان بھی ہلاک ہوگئے۔ سو سے زائد زخمی ہیں جن میں سے کئی کی حالت نازک ہے۔

واضح ہو کہ گورکھپور مافیا ڈانوں کا گڑھ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی یہاں کی سیاست پر بالادستی ہے اور اکثر و بیشتر ان کی آپسی لڑائی سے گورکھپور کا امن و امان تباہ ہوتا رہا ہے۔ کانگریس، بی جے پی اور سماج وادی پارٹی میں مافیا لیڈروں کی گھس پیٹھ ہے۔ اب تک یہاں چار مافیا سرغناؤں کی بالادستی رہی ہے اور ان میں آپسی چشمک بھی ہوتی رہی ہے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ ہیں بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ اور گورکھناتھ مندر کے مٹھا دھیش مہنت اویدناتھ، کانگریس کے سابق رکن اسمبلی ہری شنکر تیواری، سماج وادی کے سابق رکن اسمبلی ویریندر پرتاپ شاہی اور تازہ حملے میں ہلاک اوم پرکاش پاسوان۔ پاسوان پہلے شاہی گروپ میں تھے بعد میں اویدناتھ کے ساتھ ہوگئے لیکن گذشتہ دنوں وہ پھر اویدناتھ کو چھوڑ کر شاہی کے ساتھ آگئے تھے۔ ان پر اس سے پہلے بھی حملہ ہو چکا تھا جس میں وہ بال بال بچے تھے۔ انہوں نے حکومت سے اضافی سیکورٹی کا مطالبہ کیا تھا جس پر عمل نہیں کیا گیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ الیکشن نوٹیفکیشن کے اجرا کے دو دن قبل یہ ہلاکت ہوئی ہے۔

مہنت اویدناتھ (دائیں) دیگر مہنتوں کے ساتھ

سماج وادی پارٹی کے لیڈروں کا الزام ہے کہ اس حملہ کے پیچھے بی جے پی کا ہاتھ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سماج وادی پارٹی گورکھپور سے مہنت اویدناتھ کے مقابلے میں پاسوان کو کھڑا کر رہی تھی اور بی جے پی کو خدشہ تھا کہ پاسوان مہنت کو ہرادیں گے اس لئے انہیں راستے سے ہٹادیا گیا۔ پاسوان کے علاوہ ہلاک ہونے والوں میں رام سندر رام ایڈوکیٹ، علی حسین خان، انعام اللہ، وسیع اللہ، کامیشور سنگھ اور امیر چند یادو قابل ذکر ہیں۔ پاسوان بانس گاؤں کے ایک جلسے سے خطاب کر کے ڈائس سے نیچے اتر رہے تھے کہ ان پر موٹر سائکل سے آئے ہوئے دو لوگوں نے بم پھینکا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔

کچھ بارسوخ ذرائع کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس قتل کے پیچھے گینگ وار کا عمل دخل ہے اور یہ سیاسی و انتخابی تشدد نہیں ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہری شنکر تیواری کو شہر کے کئی ٹھیکے نہ مل کر پاسوان اور شاہی کو مل گئے جس کی بنا پر ان پر حملہ کیا گیا۔ لیکن سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ یہ انتخابی تشدد کا پیش خیمہ ہے۔ کیونکہ شاہی گروپ بھی اس سے قبل یہاں دہشت پیدا کر چکا ہے اور اگر وہ پھر انتقام پر اتر آیا تو انتخابی عمل کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ ریاستی انتظامیہ اس خدشے سے نمٹنے کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کر رہی ہے اور قومی سلامتی ایکٹ نافذ کر کے جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کی تیاری کر رہی ہے۔ بہر حال حالات کشیدہ ہیں اور اگر الیکشن کے موقع پر تشدد آمیز کارروائیاں کر کے فرقہ وارانہ فساد بھڑکا دیا جائے تو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

کمتر برائی کو اپنانے کی آڑ میں کانگریسی لیڈروں کی جانب سے

بمبئی کے مسلمانوں پر ڈورے ڈالے جا رہے ہیں

مہاراشٹر کے گیارہ فیصد مسلم رائے دہندگان ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہیں ایک طرف کانگریس پارٹی ہے جو بابری مسجد کے انہدام اور اس کے بعد بھڑکے فسادات کی خاموش تماشائی بنی رہی تو دوسری طرف شیوسینا اور بی جے پی ہیں جنھوں نے ایک سال کی ریاستی حکومت کے دوران مسلم مخالف فیصلے لیکر یہ باور کرادیا ہے کہ وہ کبھی بھی مسلمانوں کی ہمدرد نہیں ہو سکتی ہیں اور تیسری طرف تیسرا محاذ ہے جو مذکورہ دونوں پارٹیوں کو شکست دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ سماجوادی پارٹی بھی مسلمانوں کے سامنے ووٹ کی جھولی پھیلائے ہوئے ہے لیکن اس کا بھی دائرہ اثر محض چند ایک حلقوں سے آگے نہیں ہے۔ ایسی صورت حال میں مسلم ووٹرس زبردست ذہنی کشمکش میں گرفتار ہیں۔

ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف کانگریس کے زر خرید بھی اور بے دام غلام بھی اس حکمت عملی کے تحت مسلمانوں سے گفتگو کرتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے موجود کئی برائیوں میں سے کمتر برائی کا انتخاب کرلیں۔ اور کمتر برائی کے پیمانے پر پارٹیوں کو ناپیں تو بقول ان حضرات کے کانگریس ہی کھری اترتی ہے۔

دوسری طرف ایک حلقہ کہتا ہے کہ بی جے پی اور شیوسینا اس سے زیادہ مسلم مخالفت کیا کریں گی جو اب تک وہ کر چکی ہیں۔ اس کی دلیل ہے کہ جس حکومت نے اردو اکیڈمی ختم کر دی ہو، اقلیتی کمیشن توڑ دیا ہو، ج کمیٹی تحلیل کر دی ہو، بمبئی فساد کی جانچ کرنے والے شری کرشنا کمیشن کو برخاست کر دیا ہو، گئو کشی پر پابندی لگانے کا بل پیش کر دیا ہو اور ریاست کو ہندو اسٹیٹ بنانے کے لئے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی تیاری کی ہو، وہ اب اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔ کچھ لوگ سماجوادی پارٹی کی وکالت کرتے ہیں۔ جبکہ اس کی مخالفت کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ پارٹی کلابہ جنوبی بمبئی، جنوب وسطی بمبئی، وسطی بمبئی اور گھاٹ کوپر کے علاوہ کہیں ہے ہی نہیں لہٰذا اسے ووٹ دینا اپنے ووٹ کو برباد کرنا ہے۔ لیکن سماج وادی لیڈر اور مسلم لیگ کے سکریٹری یوسف ابراہانی کہتے ہیں کہ بمبئی کے جن علاقوں میں فساد بھڑکا تھا وہاں کے مسلمان یہ طے کئے بیٹھے ہیں کہ وہ کانگریس کو ووٹ نہیں دیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کانگریس کو کمتر برائی جانتے ہیں لیکن اگر وہ بھنڈی بازار یا محمد علی روڈ کے مسلمانوں کے سامنے یہ دلیل رکھیں تو وہ لوگ ان کی پٹائی کے علاوہ کچھ نہیں کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ صورت حال شیوسینا اور بی جے پی کی معاون ثابت ہوگی لیکن اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کانگریس نے ہم کو دھوکہ دیا ہے اور ہم کانگریس کو ووٹ نہیں دے سکتے۔

لیکن کانگریس نے درگاہی سیاست کا دامن تھام کر اس حلقے کے مسلمانوں کو رام کرنے میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس لئے رضا اکیڈمی کی طرف سے کانگریس کو بحیثیت کمتر برائی کے اپنانے کی وکالت کی جا رہی ہے۔ اکیڈمی کے ذمہ داران یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ کانگریس نے ہمارے مذہب پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ یہ لوگ اتنی جلدی بابری مسجد سانحہ اور پرسنل لا میں مداخلت اور دیگر مذہبی معاملات میں کانگریس کی دخل اندازی کو فراموش کر بیٹھیں گے کسی کو توقع نہیں تھی۔ بمبئی کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس موقف کے پیچھے سکوں کی کھنک کی کارفرمائی ہے۔ ورنہ کانگریس کی حمایت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

نہ صرف بمبئی بلکہ مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں بھی مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی ہے جیسے مالے گاؤں، اورنگ آباد، عثمان آباد، بھیونڈی، لاتور، ناگپور، اکولہ، رائے گڑھ اور بلڈھانا۔ لیکن ان سبھی علاقوں میں مسلمان شش و پنج کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ریپبلکن پارٹی کا تیسرا محاذ جسے جنتادل کی حمایت حاصل ہے موجود ہے لیکن وہ بھی کانگریس یا بی جے پی سینا کو شکست دینے کا اہل نہیں ہے۔ ایسی صورت حال میں مہاراشٹر کے مسلمانوں پر زبردست ذمہ داری آن پڑی ہے انہیں انتہائی سوجھ بوجھ اور سیاسی عاقبت اندیشی سے کام لیکر فیصلہ کرنا ہوگا ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوست نما دشمنوں کی چالوں میں پھنس جائیں اور بعد میں کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے۔

دراندازوں کے بہانے آسامی مسلمانوں کے خلاف طلبہ لیڈروں کی خطرناک مہم

دو شمارہ پہلے ایک رپورٹ میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح آسام میں غیر ملکی دراندازوں کے نام پر مسلمانوں کے نام ووٹر لسٹ سے کٹوانے اور نیلی کے بھیانک حادثے کو دوہرانے کی سازشیں رچی جارہی ہیں۔ آسام کی طلبہ تنظیم آل آسام اسٹوڈینٹس یونین (آسو) اس معاملے کو کس طرح گرم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انتخابی تاریخوں کے اعلان کے بعد اس مہم میں شدت آگئی ہے اور آسو دوسری تنظیموں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اس مہم کو تیز کرنے میں لگ گئی ہے۔ گذشتہ دنوں اس کے لیڈروں نے اپنے مطالبات کے حق میں بھوک ہڑتال کی اور عدالتی گرفتاری بھی دی۔

آسو کے لیڈروں کی بھوک ہڑتال: مسلمانوں کے خلاف خطرناک چال

آسام کے ساہتیہ سبھا کے ۶۲ ویں اجلاس کے موقع پر سبھا کے ساتھ ساتھ آل آسام گن سنگرام پریشد اور آسو نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اول الذکر دونوں تنظیمیں جہاں اس تحریک کو دوسرے محاذ پر گرم کر رہی ہیں وہیں آسو اپنے مسلح ونگ کو سرگرم کر رہی ہے۔ وہ اپنی پوری طاقت لگادینا چاہتی ہے۔ جبکہ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۵ تک چلی اس تحریک کے روح رواں سابق وزیر اعلی اور وزیر داخلہ پرفل کمار موہنتا اور بھرگو کمار پھوکن بعد میں جن کی آسام گن پریشد کے تحت حکومت قائم ہوئی تھی خاموش ہیں۔ ان لوگوں کی حکمت عملی

باقی صفحہ ۱۶ پر

یہی شیخ حرم ہیں جو چرا کر بیچ کھاتے ہیں......

ملت کی پشت میں خنجر گھونپ کر خود ساختہ ٹھیکیداروں نے کیا مسلم ووٹ کا سودا

انتخابی بازار لگ گیا ہے، دوکانیں سج گئی ہیں، خرید و فروخت شروع ہو گئی ہے، اس بازار میں خریداروں کا بھی ہجوم ہے اور دوکانداروں کا بھی۔ سودے بازوں اور دلالوں کی بھی بن آئی ہے۔ کمیشن طے ہو رہے ہیں اور منافع پر نظریں گڑی ہیں، کوئی اپنا سرمایہ بیچ چکا ہے تو کوئی ابھی سودے بازی میں پھنسا ہوا ہے۔ اس بازار میں ایک ایسی چیز بھی بیچی جارہی ہے جو پہلے بہت قیمتی تھی مگر اب بہت ارزاں ہو گئی ہے۔ جس طرح اس کے خریداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے اسی طرح بیچنے والوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ قیمتی شے وہ نہیں بیچ رہا ہے جو اس کا مالک ہے بلکہ وہ لوگ بیچ رہے ہیں جو چھین جھپٹ کر اور چرا کر لے آئے ہیں۔ یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ یہ قیمتی شے چپکے چپکے بیچ دی جاتی ہے اور اس کے اصل مالک کو علم بھی نہیں ہو پاتا۔ اسے اس کی قیمت بھی نہیں ملتی اور جب بازار ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا سرمایہ لٹ چکا ہے، اس کی کل کائنات قزاقوں کی جھولی میں چلی گئی ہے، وہ خالی ہاتھ اور تہی دامن ہو گیا ہے۔ دلالوں کی جیبیں گرم ہو گئی ہیں، ان کے بینک بیلنس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے انداز بود و باش اور طرز زندگی میں اچانک زبردست تبدیلی آگئی ہے اور اصل مالک پہلے بھی محرومیوں کا شکار تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے اس کی قیمتی شے کا معاوضہ نہیں ملتا۔ بازار اٹھنے کے بعد اچانک احساس ہوتا ہے کہ اس کی پشت میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے اور اسے پھر اگلے بازار کے سجنے تک یکہ و تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ قیمتی سرمایہ بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کی عزت نفس ہے، ان کا ضمیر ہے، ان کی خودداری ہے۔ یہ چیزیں پہلے بھی سیاسی دلالوں کے ہاتھوں بک جاتی تھیں اور اب بھی بک رہی ہیں مسلمان پہلے بھی بے بس و لاچار اور محروم و نامراد ہوا کرتا تھا اور آج بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دلالوں کے چہرے بدل گئے ہیں پرانے دوکانداروں کی جگہ نئے دوکانداروں نے لے لی ہے۔ انتخابات کا موسم آتے ہی کوئی سیکولرزم کی دہائی دینے لگتا ہے تو کوئی جمہوریت کی۔ کوئی اقلیت نوازی کی تو کوئی مسلم مسائل کی۔ کوئی کہتا ہے کہ فسطائی طاقتوں کو شکست دینا وقت کی آواز ہے تو کوئی کہتا ہے کہ سیکولر طاقتوں کی حمایت نہیں کی گئی تو ہندوستانی مسلمان غیر سیکولر عناصر کے ہاتھوں غلام بن جائیں گے، کوئی کہتا ہے کہ سب سے پرانی اور سب سے بڑی جماعت کانگریس کو ووٹ دیجئے تو کوئی کہتا ہے کہ نہیں کانگریس مسلمانوں کی دشمن ہے، اس نے آج تک مسلمانوں سے چھیننے کے بجائے انہیں کچھ دیا ہی نہیں ہے۔ اس لئے حکمرانی کا موقع دوسری جماعتوں کو دینا چاہیے۔ گویا مسلمانوں کے گلے میں کانگریس کے طوق غلامی کو اتار کر دوسری جماعت کا طوق ڈال دیا جائے۔

> مسلم نظر آنے والے ناموں کے پلیٹ فارم سے اپیل کی جانے لگی کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں تاکہ فرقہ پرست قوتوں کو شکست دی جاسکے۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ بحیثیت مسلمان یہ ساری جماعتیں ان کی دشمن ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ اس ملک کا سیاسی نظام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، اس ڈھانچے میں مسلمان بحیثیت مومن فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں اور اس سسٹم میں ملی مفادات کے تحفظ کا کوئی سامان ہے یا نہیں، سیاسی سوداگر مسلمانوں کے پیروں میں پڑی ہوئی اس نظام کی بیڑی کو اور سخت کرنے کے درپے ہیں۔ البتہ یہ سوداگر اس بیڑی پر اپنے سیاسی قبیلے کا ٹریڈ مارک لگا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کے پیروں میں غلامی کی بیڑی کو سخت کرنے میں کن کن سوداگروں کی خدمات رہی ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد جب مسلمان من حیث القوم کانگریس سے دور ہو گیا اور اس کی ناراضگی کے تھپیڑے مسلم دشمن نظریات کی حامل جماعتوں کے ساتھ ساتھ خود کو سیکولر نظریات کی حامل ہونے کا دعوی کرنے والی کانگریس کے چہرے پر بھی پڑے تو کانگریسیوں کو احساس ہوا کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے غلطی کی معافی مانگ کر مسلمانوں کو از سر نو بیوقوف بنانے کی راہ سجھائی۔ لیکن کانگریس قیادت کی انا آڑے آگئی اور معافی تلافی سے انکار کر دیا گیا۔ لیکن جوں جوں انتخابات کا موسم قریب آتا گیا کانگریسی لیڈر گھما پھرا کر معافی کی باتیں کرنے لگے گویا یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ "انہیں افسوس ہے۔" کچھ کانگریسی مسلمانوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کو بابری (بابری مسجد) کا نہیں برابری کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ شاید وہ بھول گئے کہ جب عبادت گاہ ہی نہیں رہے گی تو کیسی برابری اور کیسی مساوات۔

اجمیر شریف میں وزیر اعظم کی دستار بندی

الیکشن کا موسم اور قریب آیا تو کچھ اور کھل کر باتیں ہونے لگیں۔ ایک برہمن ایلچی درگاہوں اور خانقاہوں کی زیارت کے نام پر روٹھے ہوئے مسلمانوں کو منانے کے لئے عشوہ و غمزے کا بھی سہارا لینے لگا اور پورے ملک میں گھوم گھوم کر یہ بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ میری آستینوں میں بت نہیں ہیں۔ میں تو خانقاہوں اور درگاہوں پر لٹائے جانے والے قومی یک جہتی کے بتوں کا دیوانہ ہوں اور اگر مسلمان میری اس بات پر یقین کرلیں تو شیخ و برہمن کے درمیان کا امتیاز ختم ہو جائے گا۔ نام نہاد مسلم نمائندوں نے برہمن کو بجائے یہ سمجھانے کے کہ سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے، تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے۔ وہ خود اپنی آستینوں میں سیاسی مفاد پرستی کے بت چھپانے کی روایت قائم کرنے لگے۔ سب کچھ ہوتا رہا لیکن کوئی اس جذبے کا قائل نظر نہیں آیا کہ۔ اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں، مجھے ہے حکم اذاں لاالہ الااللہ۔

آل انڈیا "علماء و مشائخ" کانفرنس : شیخ و برہمن کا اجتماع

بجائے اس کے مسلم نظر آنے والے ناموں کے پلیٹ فارم سے اپیل کی جانے لگی کہ مسلمان کانگریس کو ووٹ دیں تاکہ فرقہ پرست قوتوں کو شکست دی جاسکے۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ بحیثیت مسلمان یہ ساری جماعتیں ان کی دشمن ہیں۔ بابری مسجد شہید کر دی گئی، دوسری مساجد پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے اور مسلم کش فسادات میں لاتعداد مسلمانوں کو گاجر مولی کی مانند کاٹ دیا گیا اور مسلمانوں کی عزت نفس کچل دی گئی لیکن ایک حلقہ اب بھی اس ظالم طبقے کی حمایت کی اپیل کر رہا ہے جو برسوں سے مظالم کے پہاڑ توڑتا آیا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام میں جس کا رول جگ ظاہر ہے۔ اس سے بابری مسجد کے تعلق سے "ٹھوس یقین دہانی" کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور اس آڑ میں مسلمانوں کی حمایت کی قیمت وصول کی جارہی ہے۔ حالانکہ آزادی سے لیکر آج تک یہ جماعت مسلمانوں کو وعدوں اور یقین دہانیوں ہی پر ٹرخاتی رہی پھر بھی کہا جارہا ہے کہ تم بابری مسجد کے بارے میں یقین دہانی کرا دو ہم تمہیں ہندوستانی مسلمانوں کے ووٹ دلوا دیں گے۔ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کرنے اور یکساں سول کوڈ کے عدم نفاذ کی بھی یقین دہانی مانگی جارہی ہے۔

> بابری مسجد کے تعلق سے "ٹھوس یقین دہانی" کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور اس آڑ میں مسلمانوں کی حمایت کی قیمت وصول کی جارہی ہے۔ حالانکہ آزادی سے لیکر آج تک یہ جماعت مسلمانوں کو وعدوں اور یقین دہانیوں ہی پر ٹرخاتی رہی پھر بھی کہا جارہا ہے کہ تم بابری مسجد کے بارے میں یقین دہانی کراؤ۔

کیا طرفہ تماشہ ہے کہ قاتل سے کہا جارہا ہے کہ اچھا اب قتل مت کرنا اور مظلوموں سے کہا جارہا ہے کہ وہ تمہارا مسیحا ہے۔ اس کا دامن نہ چھوڑنا۔ اس الیکشن میں ایک بار پھر بے ضمیری اور ملت فروشی کی داستان میں مزید ابواب کا اضافہ ہو گیا ہے، ملت کی بے چارگی اور بڑھ گئی ہے اور خودداری و عزت نفس کا ایک بار پھر سودا کر دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

یہی شیخ حرم ہیں جو چرا کر بیچ کھاتے ہیں
گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

بابری مسجد منہدم کروانے کی قیمت: پولیس افسر کو بی جے پی کا ٹکٹ

۶ دسمبر ۹۲ء کو بابری مسجد پر تعینات پولیس سپرنٹنڈنٹ ڈی بی رائے کو بی جے پی نے ٹکٹ سے نوازا ہے۔ یہ سلطان پور سے بی جے پی کے ٹکٹ پر پارلیمانی الیکشن لڑ رہے ہیں۔ بابری مسجد انہدام کے بعد جب بی جے پی کی چاروں ریاستی حکومتوں کو برخاست کر دیا گیا تھا تو اس کے کچھ دنوں کے بعد ڈی بی رائے نے اپنا استعفی پیش کر دیا تھا۔ لیکن حکومت نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اور مرکزی ایڈمنسٹریٹو ٹربیونل نے انہیں پھر ان کی جگہ پر بحال کر دیا۔ ان کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ بھی چل رہا ہے جو بابری مسجد انہدام سے تعلق رکھتا ہے۔

سلطان پور میں راجپوتوں کی اکثریت ہے اور انہیں اسی لئے ٹکٹ دیا گیا ہے کہ ایک تو انہیں راجپوتوں کا ووٹ ملے گا دوسرے اپنی "خدمات" کے صلے میں بھی یہ کچھ نہ کچھ ووٹ لے کر رہیں گے لہذا ان کی پوزیشن خراب نہیں رہے گی اگر ذرا سی محنت کر دی جائے تو یہ اپنی نشست نکال سکتے ہیں۔ گویا بی جے پی نے انہیں ان کی "خدمات" کا صلہ دیا ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی وہ کئی لوگوں کو ان کا صلہ دے چکی ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا سلطان پور کے سیکولر رائے دہندگان کا کام ہے کہ وہ کسی صاف ستھری امیج والے امیدوار کو کامیاب بناتے ہیں یا بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری سے بے وفائی کرنے والے ایک پولیس افسر کو کامیاب بناتے ہیں۔ ان کا کیا حشر ہو گا یہ وقت بتائے گا۔

لاکھوں ملحدوں کے توپ وتفنگ مٹھی بھر اہل ایمان پر غلبہ پانے میں ناکام

ماسکو میں یہ احساس عام ہے کہ چیچنیا روس کے لئے ویتنام ثابت ہو رہا ہے

چیچنیا اور روس کی اندرونی صورتحال کا تفصیلی جائزہ

ایک وقت امریکی لیڈر شپ ویتنام پر اپنے کنٹرول کو ضروری تصور کرتی تھی چاہے اس کے لئے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ لیکن امریکی عوام اس پالیسی کے سخت مخالف تھے۔ امریکی سماج کے اس رویے کو دیکھ کر ویتنامی گوریلاؤں نے بعض ایسے اقدامات کیے جس سے امریکی عوام کو یقین ہوگیا کہ وہ ویتنام کی جنگ ہار چکے ہیں۔ اس احساس کے نتیجے میں پورے امریکہ میں عوام اپنی حکومت کی ویتنام پالیسی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجبوراً امریکہ کو ویتنام سے اپنی فوجیں واپس بلانی پڑیں۔

ایسا ہی کچھ آجکل چیچنیا میں بھی ہورہا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۴ء میں روس کی فوجوں نے چیچنیا کے آزادی پسندوں کے خلاف حملہ کردیا۔ پانچ ماہ کی شدید جنگ کے بعد روسی فوجیں دارالحکومت گروزنی اور دوسرے اہم شہروں پر قابض ہوگئیں۔ لیکن جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ جوہر دودائیف کے جانباز حریت پسند جنوب کے پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور وہاں سے اپنی جنگ جاری رکھی۔ چیچن مجاہدین کے گوریلا حملوں نے روسی فوج کے حوصلے پست کردیے ہیں جس کی وجہ سے وہ بہادروں کی طرح جنگ لڑنے کے بجائے بربریت پر اتر آئی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی، چوری اور لوٹ کھسوٹ آج روسی فوجوں کا اصل مشغلہ ہوگیا ہے۔

چیچنیا کی جنگ بورس یلتسن اور ان کی حکومت کے لیے ویتنام ثابت ہورہی ہے۔ عوام اس خونیں جنگ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یلتسن بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس جنگ سے ان کی سیاسی زندگی اور مستقبل مسلسل خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آئندہ جون کے پہلے ہفتے میں روس میں صدارتی انتخابات ہونے ہیں جس میں بورس یلتسن امیدوار ہیں۔ یلتسن کی فتح کا دارومدار بہت حد تک چیچنیا کی صورتحال پر منحصر ہے۔

چیچن مجاہدین کا ہر حملہ اور ہر قدم یلتسن کے لیے نئے مسائل کھڑے کردیتا ہے۔

اس وقت روسی عوام تین بڑے مسائل سے دوچار ہیں۔ اول پورے روس میں جرائم میں شدید اضافہ ہوا ہے جسے انتخاب سے قبل دو ماہ میں ختم کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دوم روس کی معیشت جو کافی خراب حالت میں ہے، اس محاذ پر یلتسن کے پاس کامیابی کے لیے کوئی فارمولہ نہیں ہے۔ البتہ ان کے مداح مغربی ممالک ضرور ان کی مدد کررہے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ ایک مغرب نواز روس خود مغرب کے مفادات کے لیے ضروری ہے، مغربی طاقتوں نے انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ کو مجبور کیا ہے کہ وہ روس کو اربوں ڈالر قرض کے طور پر دے۔ بلاشبہ اس سے روسی معیشت کو مدد ملے گی۔ لیکن چیچنیا کی جنگ روسی معیشت کے لیے ایک مستقل دردسر بنی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس محاذ پر یلتسن کی مسلسل ناکامیوں سے روسی عوام کافی پریشان ہیں اور ان سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

چیچن مجاہدین نے بھی روسی عوام کی بے چینی کو محسوس کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات سے قبل وہ ایسے حملے اور اقدامات کرنا چاہتے ہیں جن سے انہیں یقین ہوجائے کہ چیچنیا کی جنگ جیتنا مشکل ہے۔ چنانچہ مجاہدین نے اپنے لگاتار حملوں سے نہ صرف روسی فوج بلکہ روس کی سیاسی قیادت کی بھی نیند حرام کررکھی ہے۔

روسی فوجی چیچن مجاہدین کے آگے بے دست و پا ہوگئے

> اپنی سیاسی موت سے بچنے کے لئے یلتسن نے ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ کی۔ پہلی بار انہوں نے اعتراف کیا کہ ہوسکتا ہے چیچنیا کے خلاف ان کا فوجی قدم غلط رہا ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ ان کے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔

جنوری ۱۹۹۶ء میں چیچن مجاہدین نے روس کے اندر حملہ کرکے بہت سے روسیوں کو یرغمال بنالیا۔ اس سے قبل بھی چیچن مجاہدین ایسے حملوں سے روسیوں کو جھکا چکے تھے جس کی یلتسن کو بھاری سیاسی قیمت دینی پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس بار روسیوں نے یرغمالوں کو چھڑانے کے لئے فوجی کارروائی کی۔ لیکن اس کارروائی میں ۱۵۰ چیچن مجاہدین کے ساتھ ۲۸ سے زائد روسی فوجی بھی کام آگئے۔ کتنے ہی مجاہدین رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر، جس میں ان کے لیڈر بھی شامل تھے، اس گاؤں سے فرار ہوگئے جسے روسی فوجیوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ یلتسن نے اس آپریشن کے بعد کامیابی کے بلند بانگ دعوے کیے مگر مبصرین نے ان کے اس قدم کی سخت تنقید کی۔ اس اقدام کے بعد چیچن مجاہدین نے فروری کے شروع میں گروزنی میں زبردست مظاہرے کیے جس کے دوران انہوں نے نہ صرف روسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ آزادی پسند لیڈر جوہر دودائیف کے حق میں بھی نعرے لگائے۔ اس سیاسی ریلی کے ساتھ فروری اور مارچ میں مجاہدین نے روسی فوجوں کے خلاف کئی بڑے آپریشن کیے۔ روسی کنٹرول کے قصبوں اور شہروں پر حملہ کرکے قبضہ کرلیے۔ اول ایسے حملے چھوٹے شہروں پر ہوئے۔ لیکن مارچ میں چیچن مجاہدین نے خود دارالحکومت گروزنی پر ایک زبردست حملہ کیا اور اہم مقامات پر قبضہ کرلیا۔

گروزنی پر یہ حملہ نہ صرف چیچن مجاہدین کی بہادری بلکہ ان کے فوجی دماغ اور حکمت عملی کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ گروزنی کے اندر اور باہر کافی تعداد میں روسی فوجیں موجود ہیں۔ چاروں طرف چیک پوائنٹ بنے ہوئے ہیں۔ الغرض کوئی بھی شخص شہر میں روسی فوجوں کی نظر سے بچ کر داخل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود تقریباً دوہزار چیچن مجاہدین اپنے ہتھیاروں کے ساتھ خاموشی سے داخل ہوگئے اور اچانک حملہ کرکے اہم سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرلیا۔ روسی فوج نے ہفتے بھر کی جوابی کارروائی کرکے چیچن مجاہدین کو پسپا کردیا لیکن اس میں ۵ سو سے زائد روسی فوجی کام آگئے۔ ظاہر ہے اس کے بعد روس میں ایک سیاسی بھونچال آگیا۔

یلتسن بازی ہار چکے ہیں

اپنی سیاسی موت سے بچنے کے لیے یلتسن نے ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ کی۔ پہلی بار انہوں نے اعتراف کیا کہ ہوسکتا ہے چیچنیا کے خلاف ان کا فوجی قدم غلط رہا ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ ان کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ وہ فوجی کارروائی کو جاری رکھیں یا وہاں سے فوجیوں کو واپس بلالیں دونوں ہی صورتوں میں انہیں زبردست سیاسی نقصان اٹھانا پڑے گا۔

حال ہی میں یلتسن نے اعلان کیا ہے کہ وہ جلد ہی چیچنیا میں امن کے قیام کے لیے ایک نئے پلان کا اعلان کریں گے۔ لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے جاری روسی پالیسی سے وسیع پیمانے پر مختلف نہ ہوگی۔ روس کی موجودہ پالیسی یہی رہی ہے جسے وہ ناکامی کے ساتھ افغانستان میں پہلے ہی آزما چکا ہے۔ یعنی نواز حکومت کو مزید مستحکم کرنا اور گاؤں اور شہروں کے لیڈروں اور بزرگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ جوہر دودائیف کے حامیوں کو اپنے یہاں پناہ نہ دیں۔ روسیوں کے دعووں کے مطابق بہت سے گاؤں اور شہروں نے روس کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرلیا ہے۔ لیکن جو گاؤں یا شہر اس قسم کے معاہدے سے انکار کرتا ہے روسی فوج اس کے خلاف زبردست کارروائی کرتی ہے۔ طیارے فضا سے آگ برساتے اور زمین سے ٹینک اور آرٹلری تباہیاں مچاتی ہیں۔ ایسے حملوں میں کئی گاؤں تباہ ہوچکے ہیں۔ اب تک تین ہزار سے زائد معصوم شہری ہلاک ہوچکے ہیں۔ روسیوں کا خیال ہے کہ اس بربریت کے مظاہرے کو دیکھ کر چیچن عوام دودائیف کی حمایت سے باز آجائیں گے۔ لیکن ہوا ہے اس کے برعکس۔ نہ صرف چیچن عوام بلکہ روس کی حمایت یافتہ "چیچن حکومت" بھی اس بربریت پر چیخ اٹھی ہے۔ گروزنی کی کٹھ پتلی حکومت نے اس بربریت کے خلاف روس سے احتجاج کیا ہے۔ خود روس کے اندر بھی لبرل طبقہ یلتسن کی بہیمانہ کارروائیوں سے سخت ناراض ہوکر ان سے مزید دور ہوچکا ہے۔

> جو گاؤں یا شہر اس قسم کے معاہدے سے انکار کرتا ہے روسی فوج اس کے خلاف زبردست کارروائی کرتی ہے۔

ترکی میں اسلام پسندوں کو حکومت سے دور رکھنے کی مغربی سازشیں کامیاب

اہل مغرب اور ترکی کے مغرب نواز طبقے کی کوششیں آخر کار کامیاب ہوئی گئیں۔ ان عناصر کا ایک ہی مقصد تھا یعنی کسی بھی قیمت پر نجم الدین اربکان کی ویلفیر پارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنا۔ اپنے اس مقصد میں وہ لوگ اس وقت کامیاب ہوئے جب تانزو چیلر اور ان کے حریف یسوت یلماز نے ایک ساتھ حکومت بنانے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس سے قبل ایسا لگتا تھا کہ یلماز اور اربکان حکومت قائم کریں گے۔ لیکن بالآخر ترکی اور مغرب کے سیکولر عناصر کے دباؤ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب اور اس کے مشرقی ہمنوا اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اسلامی ممالک کے معاشی مسائل وہاں کے عوام کو ان پارٹیوں سے قریب لارہے ہیں جو اسلامی نظام کی علمبردار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب یہ لوگ مسلم ممالک کی معاشی حالت درست کرنے میں مصروف ہوگئے ہیں۔ ترکی کی نئی حکومت بھی ویلفیر پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے کے لیے ملک کے معاشی مسائل کو حل کرنے پر خصوصی توجہ دینا چاہتی ہے۔ یلماز اور چیلر دونوں ہی مغرب کے اشارے پر مارکیٹ یا منڈی معاشیات کے قائل ہیں۔ اس پالیسی کے تحت دونوں ہی ملک کی معاشیات کو لبرل کرنے اور اسے نجی ہاتھوں میں دینے کے حق میں ہیں۔ لیکن دونوں کے درمیان بعض امور پر اختلافات بھی ہیں۔

یلماز اور چیلر بعض معاملات خصوصاً معاشی امور پر یکساں رائے کے حامل ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے سخت حریف رہے ہیں۔

> اگرچہ سردست اسلام پسند ویلفیر پارٹی کو سب سے بڑی پارٹی ہونے کے باوجود اقتدار سے باہر کردیا گیا ہے، لیکن اس کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اس بات کا پورا امکان ہے کہ نئی حکومت اپنے تضادات کا شکار ہوکر اپنے مقاصد میں ناکام ہوجائے گی۔

حالات سے مجبور ہوکر ان دونوں نے باہم ہاتھ ملانے پر رضامندی ظاہر کردی ہے لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو دل سے قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ تانزو چیلر نے یلماز کی کابینہ سے خود کو الگ کرلیا ہے۔

دراصل یلماز، چیلر معاہدے کے مطابق جو مشترکہ حکومت قائم ہوئی ہے اس میں پہلے سال وزیراعظم یسوت یلماز ہوں گے۔ پھر دو سال چیلر اس عہدے پر کام کریں گی اور آخری سال پھر یلماز اس عہدے پر براجمان ہوجائیں گے۔ اس معاہدے کے مطابق حال ہی میں یعنی مارچ کے آغاز میں یلماز نے اپنی کابینہ تشکیل دی ہے۔ لیکن تانزو چیلر نے کابینہ میں خود شمولیت کے بجائے اپنے انتہائی معتمد ساتھیوں کو شامل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کابینہ سے باہر رہنے کے باوجود وہ اس کے فیصلوں پر اثرانداز ہونے کی کوشش کریں گی۔ خاص طور سے ان امور میں

باقی صفحہ ۸ پر

۲۴ گھنٹے میں بارہ سو مسلمانوں کو قتل کیا اور لاشوں کو بلڈوزر سے زمین میں دبا دیا

بوسنیا کے جنگی مجرموں کا لرزہ خیز اقبال جرم جسے سن کر بڑے سے بڑا ظالم بھی کانپ اٹھے

"ہمیں قتل نہ کرو۔ ہمارے خاندان کے لوگ تمہیں پیسہ دے دیں گے۔" یہ الفاظ ان سینکڑوں مسلمانوں کے ہیں جو سربرینیقا پر سربوں کے قبضے کے بعد ایک بڑے میدان میں بھیڑ بکریوں کی طرح جمع کیے گئے تھے۔ یہ لوگ سربوں سے اپنی زندگی کی امان مانگ رہے تھے مگر ہوا وہی جسے اقبال نے یوں کہا ہے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔

اچانک گولیوں کی بوچھار ہوئی اور زندگی کی جنگ لڑنے کے بجائے ظالموں سے زندگی کی بھیک مانگنے والے یہ سارے بوسنیائی مسلمان آنا فانا لقمہ اجل بن گئے۔

حال ہی میں فرانس کے ایک روزنامے نے ایک ۲۵ سالہ سرب سپاہی کا انٹرویو شائع کیا ہے جس میں اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے۔ یہ سرب سپاہی ڈریزن ایرڈیموک ہے جو انٹرنیشنل وار کرائم ٹریبونل کو مطلوب ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک قسم کا ضمیر کا بحران تھا جس نے اسے بے گناہ مسلمانوں کے قتل پر آمادہ کیا۔ ڈریزن بقول خود آج اپنے گناہوں پر پشیمان ہے۔

ڈریزن کا کہنا ہے کہ اس نے بذات خود ۷۰ مسلمانوں کو قتل کیا۔

اس کے اپنے الفاظ میں "میں نے ممکن حد تک کم سے کم لوگوں کو قتل کرنے کی کوشش کی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے اپنے ایک ساتھی سے سرگوشی میں کہا کہ خدا وہ سب جانتا ہے جو آج ہم نے کیا ہے۔ جوابا اس ساتھی نے کہا کہ خاموش رہو اور قتل کرتے رہو۔"

انٹرنیشنل وار کرائم ٹریبونل، جس کا صدر مقام ہالینڈ کے شہر ہیگ میں واقع ہے، حال ہی میں سرب حکومت کی اجازت سے ان مشکوک افراد سے انٹرویو کرنے سربیا گیا ہوا تھا جہاں اکثر جنگی مجرم رہ رہے ہیں۔ یہ کورٹ اب تک ۵۳ جنگی مجرموں کا پتہ لگا چکا ہے لیکن ان میں صرف ۲ ہی اس کی تحویل میں آسکے ہیں۔ بقیہ سب فرار ہیں۔ یہ انٹرنیشنل کورٹ اور دوسرے حقوق انسانی کے ادارے اس کوشش میں ہیں کہ ان ۷ ہزار مسلمانوں کا پتہ لگا سکیں جو سربرینیقا کے سربوں کے قبضے میں آنے کے بعد سے لاپتہ ہیں۔ اندازہ ہے کہ ان سب کو سربوں نے قتل کر دیا ہے۔ سربیا کے اسی دورے کے دوران انٹرنیشنل کورٹ کے وفد کی ڈریزن سے ملاقات ہوئی۔

ڈریزن ایک ۸۰ نفری کمانڈو فورس کا ممبر تھا جس کے ذمہ گرفتار مسلمانوں کو قتل کرنا تھا۔ گذشتہ سال جولائی میں سربرینیقا کے سقوط کے بعد اس یونٹ نے ۲۰ جولائی کو ۲۴ گھنٹے کے اندر ۱۲ سو مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ یہ ساری لاشیں بعد میں بلڈوزر سے زمین کے اندر دفن کردی گئی تھیں۔

ڈریزن کے اس واقعے کے بعد اپنے کمانڈر میلوراد پلیمس سے تعلقات خراب ہوگئے۔ مذکورہ قتل عام کے دو دن بعد پلیمس کے آدمیوں نے اسے گولی مار کر زخمی کردیا تھا۔ اور کچھ دنوں قبل اس نے ڈریزن کا گھر منہدم کردینے کا حکم جاری کردیا۔ اسی آخری بات نے ڈریزن کو اعتراف گناہ کرنے اور دوسروں کے راز افشاء کرنے پر مجبور کیا۔

ڈریزن کے مطابق اس نے پلیمس کی یونٹ میں جنوری ۱۹۹۵ میں شمولیت اختیار کی۔ اس یونٹ کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنا اور تباہی پھیلانا تھا۔ سربرینیقا کے قتل عام کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو غیر فوجی اور غیر مسلح مسلمانوں پر فائر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان میں سے بعض ۱۷ اور ۱۸ سال کے تھے اور کچھ پچاس یا اس سے ذرا اوپر۔ سب سے پہلے ایک بس سے ۶۰ لوگ لائے گئے۔ ان سب کو ایک لائن میں کھڑا کیا گیا اور انہیں گالیاں دی گئیں جوابا کسی نے کچھ نہ کہا۔ یہ سب قتل کردیے گئے۔ پھر جب دوسری بس سے ایسے ہی معصوم شہری لائے گئے اور انہیں ان لاشوں کے سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا تو وہ چلانے لگے کہ "ہمیں قتل نہ کرو۔ ہمارے رشتہ دار آسٹریا میں ہیں، وہ تمہارے لیے رقم لائیں گے۔" اسکے جواب میں سربوں نے کہا کہ جس کے پاس بھی دو مارک (فرینچ سکہ) ہوں وہ نکالے اس کی جان بخش دی جائے گی تو بھیڑ نے کہا کہ ان کی جیب میں جو کچھ تھا پولیس نے پہلے ہی نکال لیا ہے۔ یہ جواب سنتے ہی ڈریزن اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلا دیں اور وہ سب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ اس طرح کم از کم ۲۰ بسوں میں معصوم لوگ بھر کر لائے گئے اور وہ سب اسی طرح گولیوں سے بھون دیے گئے۔

بوسنیا کے مسلمانوں کی مظلومیت کا مداوا ہے کسی کے پاس

سب سے پہلے ایک بس سے ۶۰ لوگ لائے گئے۔ ان سب کو ایک لائن میں کھڑا کیا گیا اور انہیں گالیاں دی گئیں جوابا کسی نے کچھ نہ کہا۔ یہ سب قتل کردیے گئے۔ پھر جب دوسری بس سے ایسے ہی معصوم شہری لائے گئے اور انہیں ان لاشوں کے سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا تو وہ چلانے لگے کہ "ہمیں قتل نہ کرو۔ ہمارے رشتہ دار آسٹریا میں ہیں، وہ تمہارے لیے رقم لائیں گے۔"

ڈریزن کے مطابق ان میں سے اکثر نے ہم سے رحم کی درخواست کی اور پیسے دینے کا وعدہ کیا۔ بعض نے ہمیں برا بھلا کہا اور بعضوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ ڈریزن نے مزید کہا کہ کم از کم اس نے ایک شخص کو بچانے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسا مسلمان تھا جس کا دعوی تھا کہ اس نے ۲۰ سربوں کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ اس کے پاس ان سربوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر بھی تھے۔ ڈریزن نے اس پچاس سالہ مسلمان کا معاملہ اپنے کمانڈر کے سامنے رکھ کر کم از کم اس کی جاں بخشی کی درخواست کی۔ مگر کمانڈر نے حکم دیا کہ اسے بھی قتل کردو تاکہ کوئی بعد میں گواہی دینے کے لیے زندہ نہ رہے۔ کمانڈر کا یہ حکم لیکر ڈریزن جب لوٹا تو کہا کہ افسوس، کمانڈر کا حکم ہے کہ تمہیں بھی قتل کردیا جائے۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے گولی چلادی۔ بیچارہ تڑپے بغیر خاموش ہوگیا۔

شیعوں کے پرتشدد احتجاج کے نتیجے میں بحرین بحران میں گرفتار

گذشتہ چند ماہ سے بحرین میں کافی بے چینی پائی جارہی ہے۔ عام طور سے کہا جارہا ہے کہ وہاں کی شیعہ آبادی، جو بظاہر اکثریت میں بھی ہے، اپنی حکومت سے ناراض ہے۔ اس ناراضگی کی کئی وجہیں ہیں۔ سب سے بڑی وجہ غالبا معاشی دشواری یا ان کی غربت ہے۔ آغاز میں شیعوں کا احتجاج بڑی حد تک غیر متشدد تھا۔ مگر حالیہ دنوں میں یہ پرتشدد ہوگیا ہے۔ نئے سال کے ابتدائی تین مہینوں میں کم از کم ۹ پرتشدد حملے ہوئے ہیں جن سے کافی نقصان ہوا ہے۔ سب سے آخری حملہ ۲۰ مارچ کو ایک ہوٹل میں ہوا جس میں ۲ ہندوستانی شہری زخمی ہوگئے۔

منامہ بحرین کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کے وسط میں ملک کے اہم دفاتر قائم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سیکورٹی کا بندوبست بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ۲۰ مارچ کو اسی علاقے میں واقع ایک ہوٹل میں بم دھماکہ ہوا جس میں دو افراد معمولی طور پر زخمی ہوگئے۔ مالی و جانی نقصان تو ظاہر ہے بہت کم ہوا لیکن اس سے ہونے والے سیاسی نقصان کا اندازہ کرنا ابھی مشکل ہے۔ دراصل دھماکہ ایک ایسے ہوٹل میں ہوا جو سفارتی انکلیو سے بہت قریب ہے۔ بلاشبہ اس سے لوگوں میں یہ اندیشہ پیدا ہوگا کہ حکومت کا سیکورٹی نظام کمزور پڑرہا ہے۔

ایک یوروپی باشندہ جو دھماکے کے وقت ہوٹل میں موجود تھا، اس نے کہا کہ "اس نے ایک پرشور دھماکہ سنا اور اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا منہدم ہورہی ہے" اس نے مزید کہا: "میں باہر بھاگا۔ ہر طرف زبردست دھواں تھا اور لوگ بدحواس تھے۔ میں کچھ منٹ بعد سمجھ پایا کہ میں ایک بم حملے سے صاف صاف بچ نکلا ہوں۔" ہوٹل کے ایک ہندوستانی نژاد ملازم نے کہا کہ "یہ ہوش اڑادینے والی بات ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں دھماکوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ہم سخت خوف زدہ ہیں۔ اگرچہ ہمارے مالکان ہمیں یقین دلارہے ہیں۔"

مارچ کے دھماکے سے قبل بھی جنوری اور فروری میں دو ہوٹلوں میں بم دھماکے ہوچکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت مخالف عناصر حکومت کے خلاف معاشی جنگ چھیڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ویسے ابھی اس ضمن میں قطعیت سے کوئی بات کہنا مشکل ہے۔

بحرین میں عوامی بے چینی وقتا فوقتا پیدا ہوتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ سیاسی بحران اس وقت پیدا ہوا جب حکومت نے دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایک شیعہ عالم کو گرفتار کرلیا جس نے ۱۹۷۵ء میں تحلیل کردی جانے والی پارلیامنٹ کو دوبارہ بحال کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک مختلف پرتشدد واقعات میں کم از کم ۲۱ افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ کچھ ہی دنوں پہلے ایک ہوٹل پر حملے سے ۷ بنگلہ دیشی مزدور ہلاک ہوگئے تھے۔ ان ہنگاموں کو دیکھ کر امریکہ نے اپنے شہریوں کو آگاہ کردیا ہے کہ بحرین اب پہلے جیسا محفوظ ملک نہیں رہا۔

حالیہ دھماکوں اور احتجاجوں کے بعد بحرین کے وزیر داخلہ اور وزیر دفاع نے باہم ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد بعض مزید سخت اقدامات کیے گئے ہیں۔ اب ان لوگوں کے خلاف بند کمرہ والی عدالت میں مقدمہ چلے گا جس کے فیصلوں کے خلاف اپیل کرنا ممکن نہ ہوگا، جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ احتجاجیوں کے ساتھ ہیں۔ ایک شیعہ گروپ جو خود کو "عوامی تحریک برائے دستور" کہتا ہے، نے حکومت کے حالیہ اقدام کے بعد مزید مظاہروں کی اپیل کی ہے۔ اپیل میں کہا گیا ہے کہ "جہاد ہی ایک ایسی زبان ہے جسکو حکومت سمجھتی ہے۔" ان سارے واقعات کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ بحرین کی شیعہ آبادی بنیادی طور پر معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ بلاشبہ احتجاجیوں کے بعض لیڈروں کے مقاصد اور عزائم دیگر ہوسکتے ہیں لیکن وہ عام آدمی جو سڑکوں پر احتجاج کررہا ہے، وہ بنیادی طور سے اپنی غربت کی وجہ سے ایسا کررہا ہے۔ ظاہر ہے مظاہرین کی قیادت کرنے والے علماء ہیں اور وہ مذہب کی احتجاجی زبان میں گفتگو کررہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بحرین کا اصل مسئلہ اکثر شیعوں کی غربت ہے جسے ختم کرنے کے بجائے حکومت مزید سخت اقدامات کررہی ہے جس سے عوامی بے چینی میں مزید اضافے کا امکان ہے۔ ضرورت ہے کہ بحرین کے مسئلے کو فرقہ واریت سے بلند ہوکر اسے ایک سیاسی و معاشی مسئلہ سمجھا جائے اور اسی مناسبت سے اس کے حل کے لیے اقدامات کیے جائیں کیونکہ صرف یہی پالیسی بحرین کو حالیہ بحران سے باہر نکال سکتی ہے۔

بحرین کے مسئلے کو فرقہ واریت سے بلند ہوکر اسے ایک سیاسی و معاشی مسئلہ سمجھا جائے اور اسی مناسبت سے اس کے حل کے لیے اقدامات کیے جائیں کیونکہ صرف یہی پالیسی بحرین کو حالیہ بحران سے باہر نکال سکتی ہے۔

مشینوں کے عذاب سے امریکہ میں انسانوں کا جینا دوبھر ہوگیا ہے

امریکی پریشان ہیں کہ گوشہ عافیت کی تلاش میں کہاں جائیں

مغرب میں مشینی دنیا سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنوں پر ایک دلچسپ رپورٹ

کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مغربی زندگی کے سیاق میں اس محاورے کی صداقت جتنی آج واضح ہورہی ہے اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی بلکہ آج تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ دیواروں کے صرف کان ہی نہیں بلکہ آنکھ بھی ہوتی ہے۔ چوری اور اس کے نقصانات سے بچنے کے لیے مغرب نے تکنیکی ترقی کی بدولت خود کار اور حساس کیمروں کی شکل میں یہ دیواری آنکھیں مختلف جگہوں پر نصب تو کردیں لیکن اسے خبر نہ تھی کہ خود اس کی زندگی کے دروازے چوروں کے لیے چوپٹ کھل جائیں گے۔

ایک عام آدمی کے معمولات زندگی پر نظر ڈالئے۔ گھر سے نکل کر آفس پہنچنے، وہاں اپنے فرائض انجام دینے سے لیکر گھر واپس آکر مختلف مشاغل اور دیگر حرکات و سکنات پر نظر رکھنا، ان کا ریکارڈ رکھنا اور اس تفصیل میں سے مطلوبہ اطلاعات مرتب کرکے بازار میں فروخت کردینا ممکن ہے۔

بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے کہ ایک شخص اپنے گھر سے دفتر، یونیورسٹی، عدالت یا فیکٹری میں گیا اور متعینہ اوقات کار میں وہاں رہ کر واپس آگیا۔ تو ان باتوں کی تفصیل کے فروخت کیے جانے کا سوال کہاں سے اٹھتا ہے۔ یہ بات اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ دنیا میں عموماً اور مغرب میں خصوصاً مشینوں پر انسانی زندگی کے حد درجہ انحصار نے لوگوں کی نفسیات کو جس طرح متاثر کیا ہے اس سے ایک صارفانہ تہذیب وجود میں آئی ہے جس کے تحت زندگی کی ہر قدر کو مادیت کے حوالے سے اس کی تسکین طلب کی صلاحیت کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب واضح طور پر دو طبقوں یعنی صارف اور بائع یا تقسیم کار پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے مال بیچنے والے کو "عیار طبع خریدار" یعنی کنزیومر سائیکولوجی کی طرف سے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اور اسی صارف شناسی کا ایک حصہ ہے افراد کے معمولات کا ریکارڈ تیار کرکے ان کی مخصوص عادتوں اور روزمرہ استعمال کی چیزوں سے متعلق ان کی پسند اور ناپسند کا پتہ لگانا۔ اس سے کریڈٹ کارڈ کمپنی کو خاصا فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ کارڈ ہولڈر کی خریدی ہوئی اشیاء کا گذشتہ ریکارڈ کسی اور کمپنی کے ہاتھ فروخت کرسکتی ہے۔ مثلاً کسی کو یہ معلوم ہو کہ آپ کو ایک للن صوفہ خریدنا ہے تو اس سے متعلق دیگر تفریحی آئٹموں کے کیٹیلاگ کی بھرمار آپ کی ڈاک میں مل جائے گی۔

صارفیت سے پیدا شدہ بے تحاشا دولت سمیٹنے کے لیے جاری مسابقت کے نتیجے میں شخصی راز داری کا تصور محال ہوکر رہ گیا ہے۔

اس رجحان نے ملبوس ساز فرموں کو اپنے فٹنگ روم میں "روزن دیوار" بنانے یا خفیہ مائیکروفون رکھنے کا ثانوی جواز فراہم کردیا ہے۔ فٹنگ روم میں آپ تو اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ بڑی آزادی سے وہاں نئے کپڑوں کا ٹرائل لے رہے ہیں اور باہر سے آپ کا سب کچھ دیکھا جارہا ہے۔ حساس اور وسیع تر ٹریفک سسٹم سے اب یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ آپ گھر سے دفتر تک گاڑی میں جاتے ہوئے کن راستوں سے گذرے۔ دفتر میں کسی بزنس پارٹی سے ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کے سربراہ کو پورے مکالمات خفیہ طور پر سننے کا پورا حق ہے اور اسے ریکارڈ کرنے کا بھی۔ مارکٹنگ اور اشیاء صرف کی تیاری کے شعبوں میں کام کرنے والی فرموں کی طرف سے جاری صارفین کی نبض شناسی کی مسابقت نے کارخانوں اور دیگر اداروں میں عملے کی تقرری کے معاملات میں سرکاری دست اندازی کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امریکہ کی پانچ ریاستوں میں نو تقرر شدہ افراد کی ایک ایسی ڈائرکٹری تیار کی گئی ہے جس کا مقصد غیر قانونی تارکین وطن کو روزگار کے مواقع سے محروم کرنا ہے اور اس طرح یہ دیکھنا بھی ہے کہ کیا ان کے پاس ان ریاستوں میں سکونت پذیری کا دستاویزی جواز ہے یا نہیں۔ اسی طرح ہر اسپتال کے لیے ضروری ہے کہ مریض جب بھی ڈاکٹر کو دکھانے آئیں تو ان کی گفتگو اور صلاح و مشورے کو ڈیٹا بیس میں شامل کیا جائے۔ اس سے ایک طرف انتظامی امور پر آنے والی لاگت میں تخفیف ہوتی ہے تو دوسری جانب معالج اور مریض کے درمیان راز داری کے اصول کی پامالی بھی ہوتی ہے۔ اس طرح شخصی حقوق کے تحفظ کے حامیوں اور قانون و ضابطے کو نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان ایک تصادم کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس مسئلہ کا ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں جو بھی ڈیٹا موجود ہے وہ اس کی مرضی معلوم کیے بغیر دوسری جگہ استعمال نہ ہو۔ یعنی کہ کریڈٹ کارڈ ہولڈر کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کریڈٹ ریکارڈ کا اپنی متعلقہ فرم کے علاوہ کسی اور پر انکشاف نہ کرنا چاہیں۔ لیکن زندگی کے ہر معاملے میں اس طریقہ کار کو برتا نہیں جاسکتا۔ جہاں تک اشاروں اور مخصوص رموز و علامات میں کسی ریکارڈ کو رکھنے کی بات ہے تو اس کے مفہوم تک رسائی کو انٹرنیٹ نے آسان کردیا ہے۔ غرض کہ شخصی آزادی کی پرزور تائید کرنے والے امریکی معاشرے کے افراد گوشہ عافیت کی تلاش میں جہاں بھی جاتے ہیں کسی نہ کسی کی نگاہیں سات پردوں تک بھی ان کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

سرزمین اسلام پر کلیساؤں کی تعمیر کا مطالبہ حرم کی تقدیس کے منافی ہے

مکمل طور پر اسلامی ممالک میں کلیسا اور معبد تعمیر کرنے کے لئے بعض حلقوں کی طرف سے کیے گئے مطالبے کو متعدد علماء اور دانشوروں نے غیر ذمہ دارانہ قرار دیتے ہوئے اس پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس کی تصدیق کی ہے کہ اس پر نہ تو کسی طرح کی گفتگو ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اس پر کان دھرے گا۔ اور چونکہ اس موضوع پر اسلام نے صاف طور پر ہدایت کردی ہے اس لئے اس پر نظر ثانی کا بھی سوال نہیں رہ گیا۔ سرزمین عرب پر کلیسا یا معبد تعمیر کرنے کے مطالبے کے پیچھے بعض حاسدوں اور شرپسندوں کا ہاتھ ہے جو اسلام کی مبادیات سے بھی کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ جزیرہ نما عرب چونکہ سرزمین حرم ہے اس لئے جو لوگ ایسا مطالبہ کرتے ہیں وہ اسلامی اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اگر ویٹکن کے ذمہ داران سے کوئی پوچھے کہ وہاں کیا مسجد تعمیر کرلی جائے تو ان کا جواب ہرگز اثبات میں نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا بے بنیاد مطالبہ کرنے والے افراد مفاد پرستی میں اندھے ہوگئے ہیں۔ لہذا اسلام کی سرزمین پر مسیحی کلیساؤں اور یہودی معبدوں کی تعمیر کا مطالبہ کرنے والے عناصر کی نشاندہی کرکے اس مقدس سرزمین پر انکے قدم پڑنے سے روکا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فرمان ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ جزیرہ نما عرب کو صرف ایک دین کا گھر رہنا چاہیئے اور وہ ہے اسلام۔ ہماری مسجدوں میں خاص طور پر یہ اہتمام ہونا چاہیئے کہ ہم لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کریں اور اسلام کے خلاف کسی بھی ایسی سازش کا قلع قمع کریں۔ واضح رہے کہ اسلام نے صدیوں پہلے ایسے تمام دعوؤں اور مطالبوں کو یکسر مسترد کردیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدس مقامات پر یہود و نصاریٰ کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور بعد میں خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی اسی ہدایت پر عمل کیا۔ ایک دو نہیں بلکہ بے شمار مثالیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ سرزمین حرم پر کسی معبد کی تعمیر اس کی تقدیس و حرمت کے منافی ہے۔

جزیرہ نما عرب کو کلیسا یا معبد سے پاک رکھنے کی کوششوں کو عیسائیت شکن رجحان سے تعبیر کرنا اس بناء پر نادانی ہوگی کہ جب ویٹکن کے ذمہ داران نے وہاں مسجد بنانے کے سوال پر مثبت جواب نہیں دیا تھا تو عالم اسلام کی طرف سے اسے اسلام مخالف موقف سے تعبیر نہیں کیا گیا۔

ثقافتوں کے نام پر طوائفوں اور بھانڈوں کے مزے آگئے

پاکستانی کرکٹ ٹیم کی شکست پر ایک پاکستانی رسالے کا تبصرہ

ہار پر واویلا اچھا نہیں لگتا۔ ہار اور جیت کھیل کا لازمی حصہ ہیں لیکن جس طرح بغیر محنت اور دوسرے کی خامی یا کمزوری کے نتیجہ میں ہونے والی جیت پر طبیعت زیادہ خوش نہیں ہوتی اسی طرح اگر کوئی جیتا ہوا میچ ہار دیا جائے یا جس ہار کی معقول وجوہات نہ ہوں اس پر دکھ اور ملال بھی ضروری ہوتا ہے اور جہاں بات صرف اتنی ہی نہ ہو کہ ایک ٹیم نے دوسری کو ہرادیا بلکہ معاملہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے جذبات کا ہو تو پھر ہار جیت کا تجزیہ بھی ضروری ہوجاتا ہے اور کھلاڑیوں کا احتساب بھی۔

پاکستان میں ورلڈکپ کا انعقاد کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی کئی ورلڈکپ ہوئے۔ انگلینڈ میں، آسٹریلیا میں، نیوزی لینڈ میں بھارت میں خود پاکستان میں بھی لیکن ایسا ورلڈکپ کبھی کہیں نہیں ہوا کہ ٹورنامنٹ کے انتظامات سے زیادہ توجہ ناچ گانے اور ہلڑ ہنگامے پر صرف کی گئی ہو۔

> شاید آصف زرداری کی سمجھ میں بھی اب یہ بات آگئی ہو کہ میچ جذبوں کی سچائی، محنت اور مہارت سے جیتے جاتے ہیں۔ روپے پیسوں کی للچ سے نہیں

پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا کہ کلچر کے نام پر کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جانے لگا۔ طوائفوں اور بھانڈوں کے مزے آگئے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ہم جیتیں گے، ہم جیتیں گے کا راگ الاپنا شروع کردیا اور یہ نہ سوچا کہ اگر ہم نہ جیتے تو کیا ہوگا۔ حکمرانوں نے کھلاڑیوں میں وطن اور قوم سے محبت کا جذبہ پیدا کرنے کے بجائے لاکھوں کروڑوں کے انعام اور پلاٹ کی للچ دی۔ ٹیم کے منیجر کپتان اور پھر ہر کھلاڑی نے قوم کو پہلے ہی سے یہ یقین دہانی کرادی کہ ورلڈکپ ہماری جیب میں ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ کوئی دوسرا جیت جائے اور پھر یوں ہوا کہ فتح سے پہلے ہی منایا جانے والا فتح کا جشن ماتم و سوگ میں تبدیل ہوگیا۔

معلوم نہیں اس شکست سے کھلاڑیوں نے

باقی صفحہ ۱۲ پر

بھاجپائی کوچے میں سیاسی شباب کا سرمایہ لٹانے کے بعد

اب عارف بیگ کو عرفان حاصل ہو گیا

عارف بیگ کے بی جے پی چھوڑنے پر سہیل انجم کا تجزیہ

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا۔ بیچارے عارف بیگ نے بی جے پی سے اپنی دیرینہ رفاقت ختم کردی۔ حالانکہ انہوں نے ۲۲ برسوں سے آر ایس ایس کا پلو تھام رکھا تھا مگر اچانک عارف کو عرفان ہوا کہ بی جے پی میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ بی جے پی مسلمانوں کو نظر انداز کرتی ہے، انہیں ٹکٹ نہیں دیتی اور ان کے مسائل سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ معرفت کو پہنچتے ہی عارف نے کوچہ بتاں چھوڑ دیا اور دلگیر و دل فگار ہو کر الٹے قدم لوٹ آئے۔ حالانکہ عارف اسی گلی میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے اور سچ تو یہ ہے کہ سیاسی بلوغت کے آغاز سے لیکر آج تک وہ اسی گلی کی خاک چھانتے رہے۔ نہ صرف خاک چھانتے رہے بلکہ مسلمانوں سے بھی کہتے رہے کہ کیوں زاہد خشک بنے ہوئے ہو، یہاں آؤ، توبہ شکن مناظر کا نظارہ کرو اور بت کافر کی جلوہ سامانیوں سے لطف اٹھاؤ۔ یہی تو وہ گلی ہے جہاں سے تمہیں کامیابی کے دروازے نظر آئیں گے اور اگر اس کافر ادا کی نگاہ التفات تم پر اٹھ گئی تو تمہارے وارے نیارے ہوجائیں گے، ساری کلفتیں دور اور سارے مصائب و آلام کا خاتمہ ہوجائے گا۔

لیکن ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ بالاخر عارف بیگ کی نگاہ معرفت نے سراب کو پہچان لیا اور انہیں "بہت جلد" اس کا ادراک ہوگیا کہ اس چمک دمک کے پیچھے جو مناظر ہیں وہ انتہائی کریہہ ہیں، اس تبسم ریز چہرے کے پیچھے جو اصل چہرہ ہے وہ انتہائی بھیانک اور ڈراونا ہے اور خوفناک مسلم دشمن نعرے کی بازگشت پر شیریں کلامی کی پرت چڑھائی ہوئی ہے۔

اپنی دانست میں عارف بیگ نے انتہائی عاقلانہ، فاضلانہ اور دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی سوچ اور ان کے فیصلے پر ترس کھانے کو ہی جی چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ آسمان سے گرے تو کھجور میں اٹک گئے۔ بی جے پی سے نکلے تو کانگریس کی گلیوں میں بھٹکنے لگے۔ ایک کافر ادا کا آنچل چھوڑا تو دوسرے کا تھام لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عارف کی نگاہ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ وہ جن نظریات و عقائد کی چھاؤں میں سیاست کی "سنگلاخ" وادی میں سفر کرتے اور اب تک جس پگڈنڈی پر چلتے رہے ہیں وہاں سے کوئی نخلستان نظر ہی نہیں آتا۔ سیاست کی اس وادی میں جو زہر خیز بھی ہے اور چٹیل بھی انہیں بی جے پی، وشو ہندو پریشد، شیو سینا، بجرنگ دل یا پھر کانگریس کے خار دار درخت ہی نظر آئیں گے۔ اچھا ہوا انہیں کوئی بہتر جماعت نظر نہیں آئی ورنہ ان کا بیش قیمت سیاسی سرمایہ داؤ پر لگ جاتا۔

عارف بیگ کانگریس کے جنرل سکریٹری پی پی سوریہ کے ساتھ: آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے

> عارف بیگ کی نگاہ معرفت نے سراب کو پہچان لیا اور انہیں "بہت جلد" اس کا ادراک ہوگیا کہ اس چمک دمک کے پیچھے جو مناظر ہیں وہ انتہائی کریہہ ہیں، اس تبسم ریز چہرے کے پیچھے جو اصل چہرہ ہے وہ انتہائی بھیانک اور ڈراونا ہے اور خوفناک مسلم دشمن نعرے کی بازگشت پر شیریں کلامی کی پرت چڑھائی ہوئی ہے۔

عارف کا سیاسی سرمایہ تو یوں بھی داؤ پر لگ گیا ہے۔ اندرونی طور پر وہ بی جے پی اعلیٰ کمان اور دوسرے سینئر لیڈران سے چاہے جتنا ناراض رہے ہوں مگر بظاہر ان کی پوزیشن بہت اچھی تھی۔ بی جے پی نے اقلیتی سیل کے نام سے جو نام نہاد مسلم فوج بنا رکھی ہے عارف اس کے سپہ سالار تھے اور پارٹی کے پانچ اعلیٰ ترین عہدیداروں میں ایک نام ان کا بھی تھا۔ آخر وہ بی جے پی کے نائب صدر تھے۔ ان کی کچھ تو حیثیت رہی ہوگی۔ لیکن کانگریس میں آنے کے بعد ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو اپنی پارٹیوں کو داغ مفارقت دیکر کانگریس میں آنے والے سیاستدانوں کا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہورہا ہے۔ دہلی کے چاندنی چوک حلقہ یا پھر بعد میں دہلی کے کسی بھی حلقہ سے بی جے پی اعلیٰ کمان سے ٹکٹ مانگنے کا ان کا مطالبہ پورا نہیں ہوا تو انہوں نے پارٹی چھوڑ دی لیکن کانگریس میں انہیں کہیں سے بھی ٹکٹ نہیں ملا۔ اپنی عزت بچانے کے لئے انہیں الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کرنا پڑا۔

عارف بیگ کو ان کے من پسند حلقہ سے ٹکٹ نہیں ملا تو انہیں بی جے پی مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کرنے کی گناہ کی مرتکب نظر آنے لگی لیکن اب تک انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ بی جے پی مسلمانوں کی دشمن ہے۔ وہ تو بی جے پی کو مسلمانوں کا خیر خواہ بتاتے رہے۔ بی جے پی نے بابری مسجد منہدم کروادی تب بھی اور متعدد مسلم دشمن اقدامات میں پیش پیش رہی تب بھی وہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی دوست بنی رہی۔ یکساں سول کوڈ کا مطالبہ ہو یا پرسنل لا کی مخالفت یا کوئی اور اقدام۔ بی جے پی میں ہمیشہ انہیں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں۔ اب وہ یکساں سول کوڈ کی مخالفت بھی کر رہے ہیں اور بی جے پی کی مسلم دشمن پالیسی کا انکشاف بھی کر رہے ہیں۔ لیکن کیا وہ اس کا جواب دے پائیں گے کہ ۲۲ برسوں تک وہ اس حقیقت کو کیوں چھپائے بیٹھے رہے؟

بی جے پی کی صف اول میں دو مسلم لیڈران تھے۔ ایک سکندر بخت جو اب بھی ہیں اور دوسرے عارف بیگ۔ سکندر بخت کو وہ مسلمان نہیں مانتے۔ انہیں نام کا مسلمان کہتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ بخت کو نہ روزہ نماز سے کوئی مطلب ہے نہ اسلام سے کوئی دلچسپی، اور نہ ہی ایک بھی مسلمان ان کے ساتھ ہے۔ اگر ان کی یہ بات سچ مان لی جائے تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ عارف بیگ روزہ نماز کے بھی پابند ہیں اور اسلام سے بھی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی کوئی بہت بڑی جماعت بھی ہے۔ لیکن عارف بیگ کا یہ اسلام ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب تک اس پارٹی کو دیوانگی کی حد تک کیسے چاہتے رہے جو مسجدوں کو منہدم کرتی ہے۔ مسلم پرسنل لا کا خاتمہ کرکے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی تحریک چلاتی ہے، ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھ رہی ہے اور ایسی تین سو مساجد کی فہرست لئے گھوم رہی ہے جن کو وہ منہدم کرکے مندر بنانے کے عزائم رکھتی ہے۔

عارف بیگ کے بی جے پی سے نکلنے اور کانگریس میں شمولیت اختیار کرنے سے نہ تو عارف کا کوئی فائدہ ہوگا نہ کانگریس کا۔ ہاں بی جے پی کا نقصان ضرور ہوگیا۔ ایک تو غلامی کی حد تک وفادار اور ایک دیرینہ سپاہی نے دشمن فوج میں چھلانگ لگادی اور دوسرے الیکشن کے موقع پر بی جے پی کو یہ صدمہ جھیلنا پڑا۔ اسی لئے تو آڈوانی اور واجپئی انہیں منانے کی گھنٹوں کوشش کرتے رہے۔ بی جے پی کا خیال ہے کہ عارف کے اس اقدام سے مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کی اس کی سازشیں فاش ہوگئیں، اسے ملنے والا مسلمانوں کا چند ووٹ بھی اب اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی امیج داغدار ہوگئی۔

کیرالا میں محمد کویا انسٹی ٹیوٹ کی زمین پر آر ایس ایس کا بھگوا لہرا رہا ہے

کیرالا کی راجدھانی تروانتت پورم میں واقع محمد کویا بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ آج کل فرقہ پرستوں کے نشانے پر ہے۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد سے وابستہ شرپسند عناصر اسے اجودھیا کی بابری مسجد بنادینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کی زمین پر بھگوا جھنڈا لگادیا ہے اور اگر حکومت نے دانشمندی نہیں دکھائی تو الیکشن کے موقع پر یہاں زبردست خون خرابہ ہوسکتا ہے۔

یہ انسٹی ٹیوٹ کیرالا میں مسلم لیگ کے بانی سی ایچ محمد کویا کے نام پر ابھی گذشتہ سال اکتوبر ۱۹۹۵ میں قائم ہوا ہے۔ اس کا افتتاح نائب صدر کے آر نارائنن نے کیا تھا۔ اس وقت انہوں نے اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ آدی شنکر آچاریوں کے فلسفے پر اسلام کا اثر ہے۔ اس پر سنگھ پریوار والوں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ نائب صدر کو معافی مانگنی پڑی۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ کرونا کرن سے درخواست کی تھی کہ اسے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے لئے زمین دی جائے۔ وزیر اعلیٰ نے درخواست منظور کرلی اور اسے ۵۸۰ مربع گز زمین دیدی۔ اتفاق سے یہ زمین وہاں ایک پرانے مندر آنجنئے مندر سے متصل ہے۔ مندر کے پاس پہلے ہی سے ۲۸۰ مربع گز زمین ہے لیکن اب شرپسندوں کا کہنا ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کو دی گئی زمین مندر کو ملنی چاہئے بلکہ ان کا یہاں تک کہنا ہے کہ یہ زمین مندر ہی کی تھی جسے حکومت نے مسلمانوں کو دیدی۔ آر ایس ایس سے وابستہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس زمین میں مندر کی زمین بھی شامل ہے اور بقیہ زمین کیرالا یونیورسٹی کی ہے۔ ریاستی حکومت نے اس زمین پر انسٹی ٹیوٹ کو ۸ منزلہ عمارت بنانے کی بھی اجازت دیدی ہے۔ کچھ لوگوں کا الزام ہے کہ چونکہ ریاستی حکومت میں مسلم لیگ بھی شریک ہے اس لئے اسے خوش کرنے کے لئے حکومت نے ایسا فیصلہ لیا اور مندر کی زمین مسلمانوں کو دیدی۔ سیاسی فائدہ اٹھانے کی یہ ایک چال ہے۔ اگر واقعی وہ زمین مندر کی ہے تو حکومت کو اسے نہیں دینا چاہئے تھی اور اگر مندر کی نہیں بھی تھی تب بھی ایسی جگہ ایک مسلم ادارے کو زمین الاٹ نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اسے کم از کم ملک کی فرقہ وارانہ صورتحال کے پیش نظر ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ بہرحال حکومت کو چاہئے کہ اب وہ اس معاملے پر کڑی نظر رکھے اور کسی بھی قیمت پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برباد نہ ہونے دے۔

توہم پرستی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں یہ ہندوستانی سیاستداں

ہمارے لیڈران سیاسی کامیابیوں کے لئے خون کے غسل سے بھی گریز نہیں کرتے

ہندوستانی سیاستدانوں کی توہم پرستی کو بے نقاب کرنے والی ایک رپورٹ

انسانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ زمانہ قبل از تاریخ سے قدرت کی ان طاقتوں کی عبادت کرتا رہا ہے جن پر اس کا کوئی اختیار نہ چل سکے۔ ایک عدم تحفظ کا احساس اور ان دیکھے خطرات کا اندیشہ ہے جو فقیر ہو یا امیر، کلرک ہو کہ تاجر، افسر ہو کہ کمانڈر، لیڈر ہو کہ ٹھیکیدار، ایکٹر ہو یا گلوکار، ڈائرکٹر ہو یا پروڈیوسر، ریس باز ہو یا کبوتر باز ان سب سے توہم پرستی سے بے نیازی کے فیشن زدہ دعووں کے باوجود توہمانہ حرکات سرزد کراتا ہے۔ بلا اختیار منصب اور سماجی حیثیت کے ایسے بظاہر روشن خیالوں کی کمی نہیں کہ جن کا راستہ اگر بلی کاٹ جائے تو جب تک کہ کوئی اور جاندار یا شے مثلا کار یا رکشہ سامنے سے نہ گذر جائے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، جو گلے یا بازو میں کسی فقیر، سادھو یا عامل کا دیا ہوا تعویذ پہنتے اور باندھتے ہیں، ہر انگلی کو نایاب پتھروں کی انگوٹھی سے سجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر توہم کا راج نہ ہو۔

ٹونے ٹوٹکے، مرچ سے نظر اتارنے، مندر کے قرب و جوار میں برگد یا پیپل کے پیڑ سے لپٹے رنگین دھاگوں کی شکل میں ایک طبقہ کی عوامی زندگی پر توہم کے تسلط کی ہمیں بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ تعلیم یافتہ طبقہ خواہ ان توہمانہ رسوم پر کتنی ہی لعنت و ملامت کرے لیکن مضحکہ خیزی دیکھئے کہ یہی رسوم ملک کے غریب طبقے کے جینے کا سہارا تو ہیں ہی خوش حال اور آسودہ طبقے کے لئے بھی کئی اعتبارات سے آرزوؤں کی تکمیل کا اہم ذریعہ ہیں۔ اور ایسے افراد میں جن کی ہر خواہش پہ دم نکلے سیاسی رہنما سر فہرست ہیں۔

سیاست دانوں کی توہم پرستی کی کہانی اکثر و بیشتر اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے۔ اپنے سیاسی حریفوں کو پسپا کرنے اور اپنی سیاسی کامیابیوں کے لئے یہ لوگ ٹونے ٹوٹکے کا خوب سہارا لیتے ہیں۔ اندرا گاندھی سے لیکر آج تک کے لیڈران اکثر ان رسوم میں گرفتار ہیں۔ دھارمک شخصیات کے قدموں میں جھکنے اور ان کے پیروں کی دھول اپنی پیشانی پر لگاکر کامیابی کی توقع رکھنے میں کئی سیاستداں پیش پیش رہے ہیں یہ حرکتیں آج بھی جاری ہیں

اپنی لادینیت کے لئے معروف سابق وزیر اعظم چندر شیکھر نے بھی پیشین گوئیوں کی صداقت کو بعید از قیاس نہیں قرار دیا کیونکہ اس کا تعلق ذاتی اعتقاد و یقین سے ہے۔ اگرچہ انہیں مذہب اور خدا کے تصور نے کبھی متاثر نہیں کیا تاہم وہ اس وقت کو نہیں بھول پائیں گے جب کسی جیوتشی نے اپنے زائچے کی مدد سے ان کی تاریخ پیدائش بتادی حالانکہ یہ تاریخ خود ان کے علم میں بھی نہ تھی اور بالآخر بعد میں اس کی تصدیق ہوئی۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مرلی منوہر جوشی نے پارلیامنٹ کے اندر چندر شیکھر کے بارے میں کسی بدشگونی کی پیشین گوئی کی اور اسی دن ایک ناخوشگوار واقعہ ان کے ساتھ پیش آگیا جس کی جناب چندر شیکھر نے وضاحت نہیں کی۔

دیہی ترقی کے وفاقی وزیر جگن ناتھ مشرا جو توہم پرستی سے خود کو دور بتاتے ہیں ایسے پتھروں کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں جن سے ان کی سیاسی اور شخصی آرزوئیں بر آتی ہیں اور چونکہ ان کے نزدیک ہر پتھر کی الگ الگ تاثیر ہوتی ہے اس لئے اس کا تعلق توہم سے نہیں بلکہ عقل اور سائنس سے ہے۔

بہار کے وزیر اعلی لالو پرشاد یادو سیاسی تقریروں میں مجمع کے سامنے ضرور مذہب اور توہم پرستوں پر لعن طعن کرتے ہیں لیکن خلوت میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ان کی رہائش گاہ پر انتخابات جیتنے کے لئے مذہبی رسوم اور پوجا پاٹھ کا سلسلہ زور وشور سے چلتا ہے۔

بہار کے وزیر اعلی لالو پرشاد یادو سیاسی تقریروں میں مجمع کے سامنے ضرور مذہب اور توہم پرستوں پر لعن طعن کرتے ہیں اور اسے سادہ لوح عوام کے پیسے اینٹھنے کے لئے برہمنوں کی چال سے تعبیر کرتے ہیں لیکن خلوت میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ان کی رہائش گاہ پر انتخابات جیتنے کے لئے مذہبی رسوم اور پوجا پاٹھ کا سلسلہ زور وشور سے چلتا ہے۔ گذشتہ انتخاب میں انہوں نے وندھیا چل (اتر پردیش) کے وندھیا واشنی مندر میں منگلا جاپ کروایا تھا جس کا اصل مقصد اپنے حریفوں کو شکست دینا تھا۔ چالیس دن چلنے والے اس جاپ نے انھیں فتح مند کردیا۔ اس جاپ کے ناظم راجا پنڈا کا تو یہی کہنا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جگن ناتھ مشرا نے ۱۹۸۴ کے انتخابات میں اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے تانترک کی ہدایت کے مطابق بکرے کے خون سے غسل کیا۔ اسی طرح وزیر صحت مہابیر پرساد نے چیف منسٹر بننے کے لئے گنگا کنارے ایک ماہ تک پوجا پاٹھ کرایا۔ عام خیال یہ ہے کہ ایک تانترک کے کہنے پر کہ ممبر آف پارلیامنٹ کا منصب ان کے لئے بدشگونی کا باعث بنے گا انھوں نے چار لاکھ روپے میں اپنا راجیہ سبھا کا ٹکٹ کنگ مندرا کے ہاتھ بیچ دیا۔

جگن ناتھ مشرا نے ۱۹۸۴ کے انتخابات میں اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے تانترک کی ہدایت کے مطابق بکرے کے خون سے غسل کیا۔ اسی طرح وزیر صحت مہابیر پرساد نے چیف منسٹر بننے کے لئے گنگا کنارے ایک ماہ تک پوجا پاٹھ کرایا۔

پچھلے دنوں وزیر اعظم نرسمہا راؤ جب کرناٹک میں اڈاسی کیر کے قریب کوڈی ہالی مٹھ پر اپنے ہیلی کاپٹر سے اترے تو طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے سیاسی مستقبل کے امکانات کی تلاش میں وہاں آئے تھے تو کسی کا خیال تھا کہ مندر کی دیوی یا دیوتا کے آشیرواد سے اپنے حریفوں پر سیاسی کامیابی کے دروازے بند کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ پانچ صدیوں پرانے اس مٹھ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں آکر لوگ جو بھی مراد مانتے ہیں وہ عام طور پر پوری ہوتی ہے۔ مسٹر راؤ کے اس دورے کا مقصد جو بھی رہا ہو لیکن ایک بات صاف ہے کہ ہندوستانی عوام کا توہم پرستی سے چولی دامن کا ساتھ دنیا بھر کے لوگوں کے ذہن میں پھر سے تازہ ہوگیا ہے۔ اور جیسا کہ کہا جاچکا ہے جانور کے خون سے غسل ہو یا نگینے اور پتھروں کی انگوٹھی پہننا، یا تانترک اور سادھو سنت سے آشیرواد لینا ان سب رجحانات کے پیچھے جو مرکزی احساس ہے وہ ہے عدم تحفظ کا۔ عین ممکن ہے یہی عدم تحفظ کا احساس جناب نرسمہا راؤ کو بھی کوڈی ہالی مٹھ تک کشاں کشاں لے گیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم نے کوڈی ہالی مٹھ میں وہاں کے پروہت شواتند سوامی کے ساتھ دو گھنٹے گذارے اس مٹھ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ناریل کے پتوں کے دستاویزات کا ایک ایسا مجموعہ رکھا ہوا ہے جس پر لنکایت قوم کے افراد کے عقیدے کے مطابق ہر شخص کی مدت حیات تحریر ہے۔ پہلے یہ دستاویزات ایک شخص نیل کنٹھ کی تحویل میں تھیں اور بعد میں اس خیال سے مٹھ کے سپرد کردی گئیں کہ کسی کے گھر میں ان کی موجودگی ان کی تقدیس کے منافی ہے۔ ۱۹۷۸ میں چک منگلور سے انتخابات میں کامیاب ہونے تک اندرا گاندھی پابندی سے اس مٹھ کی زیارت کے لئے جایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما، سابق مرکزی وزیر بوٹا سنگھ بھی یہاں آچکے ہیں۔

دلچسپ یہ ہے کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے بارے میں جیوتشیوں کی پیشین گوئیوں کا کیا اثر پڑتا ہے۔ الیکٹرونکس انجینیر اور ایم بی اے سشیل چودھری جنھوں نے اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے قتل کی صحیح پیشین گوئی کی تھی ان کے مطابق مارچ اور اپریل کے مہینے راؤ جی کے لئے خاصے سخت گذریں گے اور یہ کہ حوالے میں ملوث سیاستدانوں سے نہ وہ نمٹ پائیں گے نہ وزیر اعظم بن پائیں گے۔

بقیہ: ترکی میں اسلام پسندوں کو حکومت سے دور رکھنے کی سازش

مداخلت کریں گی جن کا تعلق معاشی اصلاحات سے ہے۔

یلماز اور سیلر دونوں ہی محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے معاشی فرنٹ پر ان کی کارکردگی ہی ان کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کیبنٹ سازی کے دوران دونوں ہی کے درمیان ان عہدوں کے لیے کافی مارا ماری نظر آئی جو معاشی امور اور شعبوں سے متعلق ہیں۔ فائنانس اور انڈسٹری جیسی اہم وزارتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ مالیات، صنعت اور نج کاری کے مختلف شعبوں پر کنٹرول کے لیے دونوں ہی گروپوں نے کافی تگ و دو کی۔ بہر حال طویل بحثوں کے بعد دونوں تقسیم اقتدار پر راضی ہوگئے۔

حکومت سازی کے چند ہفتے ہی بعد یلماز حکومت نے پارلیامنٹ کے سامنے اسکی منظوری کے لئے اپنا بجٹ پیش کیا جو کافی بھاری بھرکم دعووں اور اسکیموں پر مشتمل ہے۔ جو معاشی مقاصد سامنے رکھے گئے ہیں وہ مختصرا یہ ہیں۔ افراط زر جو اس وقت ۵ ،، فیصد ہے اسے گھٹا کر ایک عددی بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملک کی کرنسی کو مضبوط بنانا، مالی حالت کو مستحکم کرنا اور معاشی ترقی کو مزید آگے لے جانا بھی نئی حکومت کے بجٹ کے عزائم میں شامل ہیں۔

حالات سے مجبور ہوکر ان دونوں نے باہم ہاتھ ملانے پر رضامندی ظاہر کردی ہے لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو دل سے قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ تانزو چیلر نے یلماز کی کابینہ سے خود کو الگ کرلیا ہے۔

لیکن ماہرین معاشیات خصوصا ترکی کے بینکوں کے مالکان اور ڈائرکٹر نئے بجٹ کو نئی حکومت کی خوش فہمی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ایسی مشترکہ حکومت جو کل تک ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے، شاید ایسے مشکل معاشی فیصلے نہ لے سکے جن سے عوام کی ناراضگی کا اندیشہ ہے۔ اور جب تک ایسے مشکل اور عوام کو "ناراض" کرنے والے فیصلے نہیں لیے جاتے نئی حکومت اپنے مقاصد اور عزائم میں کامیاب ہونے سے رہی۔ ان ماہرین کے مطابق ایسے مشکل فیصلوں کے لیے حکومت میں شامل دونوں پارٹیوں کو کافی ہم آہنگی سے کام کرنا پڑے گا جو سر دست بہت دشوار نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری بڑی مصیبت یہ ہے کہ یلماز۔ چیلر معاہدے کے باوجود یہ ایک اقلیتی حکومت ہے۔ اور اپنی بقا کے لیے بائیں بازو کی پارٹیوں کے تعاون کی محتاج ہے۔ جو بے لگام نج کاری اور حکومت کی سماجی فلاح کی اسکیموں کو ختم کرنے کے مخالف ہیں۔ ان پارٹیوں نے واضح کردیا ہے کہ حکومت کو ان کا تعاون اسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک وہ عوام دوست معاشی اسکیموں کو قائم رکھتی ہے۔ ظاہر ہے اس سے حکومت کے لبرلائزیشن اور معاشی اصلاحات کے پروگرام میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔

ان ساری باتوں کو مدنظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ سردست اسلام پسند ویلفیر پارٹی کو سب سے بڑی پارٹی ہونے کے باوجود اقتدار سے باہر کردیا گیا ہے، لیکن اس کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اس بات کا پورا امکان ہے کہ نئی حکومت اپنے تضادات کا شکار ہوکر اپنے مقاصد میں ناکام ہوجائے گی۔ ظاہر ہے اس کا فائدہ واحد اور اصل اپوزیشن ویلفیر پارٹی کو پہونچے گا۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ ویلفیر مایوس ہونے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ لگن اور محنت سے اپنی سوچی سمجھی اسکیموں اور پالیسیوں پر گامزن رہے۔

جلیل اندرابی کے بعد ۲۵ "جنگجوؤں" کا وحشیانہ قتل

کیا حکومت حضرت بل کو چرار شریف بنادینا چاہتی ہے؟

کشمیر کی صورتحال ایک بار پھر دھماکہ خیز ہوگئی ہے۔ حکومت کسی بھی قیمت پر پارلیمانی انتخابات کروالینا چاہتی ہے جبکہ کشمیر کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی اور سابق حکمراں نیشنل کانفرنس نے الیکشن کا بائکاٹ کررکھا ہے۔ جنگجو تنظیموں نے بھی الیکشن مخالف موقف اپنایا ہے۔ ادھر حضرت بل کا تنازعہ ایک بار پھر پورے زور و شور کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ جنگجوؤں کے حضرت بل سے چلے جانے کے باوجود حکومت نے ۲۵ مسلمانوں کو جنہیں جنگجو کہا جارہا ہے۔ انتہائی بیدردی سے ہلاک کرکے بزعم خود حضرت بل پر ان کے قبضے کو ناکام بنادیا ہے۔ ہلاک شدگان میں جے کے ایل ایف کے دوسرے گروپ کے رہنما شبیر صدیقی بھی ہیں۔ اس سے قبل معروف وکیل جلیل اندرابی کو بھی وحشیانہ طریقے سے قتل کردیا گیا تھا جس پر نہ صرف ایمنسٹی انٹرنیشنل بلکہ امریکہ نے بھی اظہار افسوس اور اس قتل کی انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔ ایمنسٹی نے حکومت کو مورد الزام بھی ٹھہرایا ہے۔ حکومت کے مسلح دستوں نے نہ صرف ان ۲۲ مسلمانوں کو بہیمانہ انداز میں قتل کیا بلکہ آس پاس کے مکانوں کو بھی نذر آتش کردیا۔ جس عمارت میں وہ پناہ گزیں تھے وہ ایک عرصے سے ان کا ہیڈکوارٹر تھا وہ بھی جل کر خاک ہوگیا ہے اور تمام ۲۵ ہلاک شدگان کی لاشیں بھی جھلس گئی تھیں۔ انسانیت نواز حلقوں میں شبہ کیا جارہا ہے کہ مسلح دستوں نے بلاوجہ ان افراد کو قتل کرکے یہ دکھانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ وہ جنگجوؤں پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس واقعہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ۲۲ مارچ کو تقریباً دو درجن مسلح کشمیری نوجوانوں نے حضرت بل پر "قبضہ" کرلیا۔ یہ افراد جموں اینڈ کشمیر لبریشن فرنٹ کے اس گروپ سے تعلق رکھتے تھے جو شبیر صدیقی کی قیادت میں یاسین ملک کی قیادت والی تنظیم سے الگ ہوگیا تھا۔ بعض مقامی افراد نے ان پر حکومت کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا ہے۔ حضرت بل کے علاقے میں رہنے والے باشندوں کا کہنا ہے کہ مسلح افراد کا درگاہ میں داخل ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ ایسا پہلے بھی بارہا ہوا ہے اور پولیس کھڑی تماشائی بنی رہی ہے۔

بہرحال ان مسلح افراد کے درگاہ میں داخلے کے بعد نیم فوجی دستوں نے اسے گھیر لیا۔ خون خرابے سے بچنے کے لیے علاقے کے بااثر افراد بیچ میں پڑے اور حکومت اور مسلح نوجوانوں کے درمیان ایک غیر تحریری سمجھوتہ ہوگیا۔ اس معاہدے کے مطابق مسلح جنگجوؤں کو اپنے ٹھکانوں پر جانے کا محفوظ راستہ دے دیا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ نکل کر قریب ہی واقع دو گھروں میں پناہ گزیں ہوگئے۔ لیکن اس کے بعد پولیس اور ان مسلح افراد کے مابین شاید کچھ اختلافات ہوگئے۔ بیچ بچاؤ کرنے والے بھی حکومت سے شاکی نظر آئے۔ مسلح افراد نے ان بیچ بچاؤ کرانے والوں کو دھمکی بھی دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کیا جارہا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مسلح افراد کے ساتھ جو غیر تحریری معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق جنگجوؤں کو علاقے سے باہر کسی پناہ گاہ تک جانے کی بات طے ہوئی تھی۔ لیکن حکومت اپنے اس وعدے سے بعد میں پھر گئی۔ اور اسی وجہ سے بات بگڑ گئی۔ اس اندازے کے حق میں یہ بات بھی جاتی ہے کہ گورنر کرشنا راؤ نے جب اس علاقے کا دورہ کیا تو بڑی سخت اور دھمکی والی زبان استعمال کی۔ جو ان کے معمول کے لہجے کے بالکل برعکس تھا۔ اسی وقت اہل نظر کو شبہ ہوگیا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

جنرل کرشنا راؤ اور حکومت کے دوسرے افسران نے زور دیکر کہا کہ مسلح جنگجوؤں سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن سری نگر کے باشندے اور بالعموم ہندوستانی موقف کے حامی نیشنل پریس کے صحافی بھی حکومت کے اس دعوے کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

بہرکیف ۳۱ مارچ کو پولیس ایکشن میں چند سپاہی زخمی ہوئے اور ایک رپورٹ کے مطابق ۲۲ اور دوسری رپورٹ کے مطابق ۲۵ "مسلح جنگجو" ہلاک ہوگئے جن میں جے کے ایل ایف کے سربراہ شبیر صدیقی بھی شامل ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس تصادم میں ایک طرف ۲۵ جنگجو ہلاک ہوگئے جبکہ مسلح دستوں کا ایک بھی جوان ہلاک نہیں ہوا۔ جب اس گروپ نے حضرت بل پر "قبضہ" کیا تھا تو اس وقت نہ صرف علاقے کے لوگوں کی انہیں حمایت حاصل نہیں تھی بلکہ دوسری جنگجو اور سیاسی جماعتوں نے بھی اس اقدام کی مخالفت کی تھی۔ مگر ان کی ہلاکت کے بعد رائے عامہ بدل گئی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت نے انہیں دھوکے سے مارا ہے۔ چنانچہ اس گروپ کے مخالف اور اصل جے کے ایل ایف کے سربراہ یاسین ملک اور حریت کانفرنس نے اس "قتل عام" کی شدید مذمت کی ہے۔ کئی پولیس اسٹیشنوں پر عوام کی بھیڑ نے حملہ کیا اور پولیس اور نیم فوجی دستوں پر پتھراؤ کیا۔ الغرض سری نگر اور کشمیر کی فضا ایک بار پھر خراب ہوگئی۔ ہڑتال چل رہی ہے اور معمول کی زندگی درہم برہم ہوگئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر حکومت نے اس وقت یہ قدم کیوں اٹھایا؟ لوگوں کا کہنا ہے کہ حکومت دراصل جلیل اندرابی کے بہیمانہ قتل سے توجہ ہٹانا چاہتی ہے۔ کیونکہ یہ قتل حکومت کے لئے ایک مسئلہ بنتا جارہا تھا۔

حضرت بل کے پاس جنگجوؤں کی لاش اور انسٹ میں جلیل اندرابی

> جنگجوؤں کے حضرت بل سے چلے جانے کے باوجود فوج نے ۲۵ مسلمانوں کو جنہیں جنگجو کہا جارہا ہے، انتہائی بیدردی سے ہلاک کرکے بزعم خود حضرت بل پر ان کے قبضے کو ناکام بنادیا ہے اس سے قبل معروف وکیل جلیل اندرابی کو بھی وحشیانہ طریقے سے قتل کردیا گیا تھا۔ جس پر نہ صرف ایمنسٹی انٹرنیشنل بلکہ امریکہ نے بھی اظہار افسوس اور اس قتل کی انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔

نیم والی مسجد میں خنزیر کا سر ڈال کر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش

شرپسند عناصر سیلم پور کے امن و امان کو تباہ کرنے کے درپے ہوگئے ہیں

دہلی میں سلیم پور کے مسلمان ابھی اس بدترین فساد کو فراموش نہیں کرپائے ہیں جو فرقہ پرستوں کی سازشوں کے نتیجے میں بابری مسجد انہدام کے بعد پھوٹ پڑا تھا اور جس میں اس وقت کے وہاں کے اے سی پی دیپک مشرا کا مشکوک رول رہا اور جنہیں اس رول کی بنا پر ہی فساد کے بعد دوسری جگہ ٹرانسفر کردیا گیا تھا۔ اس فساد میں نہ صرف بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے غنڈوں نے سلیم پور کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ توڑی تھی بلکہ پولیس نے بھی انہی عناصر کا ساتھ دیا تھا اور فسادات سے متاثرہ افراد کی رپورٹوں کے مطابق پولیس نے ہندو غنڈوں اور فرقہ پرستوں کا بھرپور رول ادا کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد علاقے کے مسلمانوں اور غیر مسلموں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب یہاں کوئی بھی فساد نہیں ہونے دیا جائے گا۔ کیونکہ سیاسی جماعتوں سے وابستہ شرپسند عناصر فساد کراکے اپنا سیاسی الو سیدھا کرتے ہیں اور بیچارے عوام پیسے جاتے ہیں لہذا اب کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ علاقے کے امن و امان کو تباہ کرے۔ دونوں فرقوں کی امن کمیٹیاں بھی بنیں اور حساس مواقع پر امن کمیٹیوں سے وابستہ افراد نگرانی بھی کرتے رہے ہیں لیکن یہ صورتحال شرپسند عناصر کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی ہے اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ کسی بھی طرح یہاں کے فرقہ وارانہ ماحول کو پھر خراب کردیا جائے اور اس کی آڑ میں اپنے سیاسی مفادات پورے کیے جائیں۔ اس کوشش میں وہ غیر سماجی عناصر بھی ملوث ہیں جن کی کسی سیاسی پارٹی سے وابستگی نہیں ہے لیکن فسادات جن کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتے ہیں۔

۲۸ مارچ کو ہندوؤں کا تہوار رام نومی تھا۔ شرپسندوں نے اس موقع پر فساد برپا کرنے کی سازش تیار کی اور ایک پلان کے تحت خنزیر کا سر ایک پولی تھن میں رکھ کر نیو سیلم پور کے جے بلاک کی نیم والی مسجد میں ڈال دیا۔ یہ کام دو دن پہلے کیا گیا تاکہ رام نومی تک اس معاملے کو خوب گرم کردیا جائے۔ ۲۶ کی صبح کو ہاشم نامی نوجوان نے فجر کی اذان دی اذان کے بعد اس نے دیکھا کہ مسجد کے گیٹ پر پولی تھن میں کچھ پڑا ہوا ہے۔ اس نے محلے کے بااثر مسلمانوں کو اس کی اطلاع دی۔ ابھی وہ لوگ پولیس کو مطلع کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ پولیس کی گاڑی آگئی اور تھانے کے ایڈیشنل ایس ایچ او محمد اقبال نے پیکٹ اپنے قبضے میں کرلیا اور مقامی مسلمانوں کو صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کی۔ علاقے میں کشیدگی پھیل گئی لیکن مسلمانوں نے حالات کو کنٹرول کیا اور کوئی بھی گڑبڑ نہیں ہونے دی۔ پولیس کی چوکسی اور مسلمانوں کی ہوشیاری سے ایک دن بخیر و عافیت گذر گیا لیکن اگلے دن صبح کو ہی پڑوس میں واقع کھٹکوں کی آبادی کے مندر میں خنزیر کا بغیر سر کا جسم ملا۔ علاقے کے لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ اس جسم پر سر نہیں تھا اس لئے مسجد میں پایا جانے والا سر اسی کا ہوگا۔ واضح رہے کہ وہ محلہ مکمل طور پر کھٹکوں کا ہے وہاں ایک بھی مسلمان رہائش پذیر نہیں ہے۔ پولیس کو اس کی اطلاع دی گئی اور پولیس نے اسے بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔

اس طرح شرپسندوں نے جو منصوبہ سازی کی تھی پولیس اور عوام کی چوکسی سے وہ ناکام ہوگئی اور علاقے کے امن و امان کو تباہ کرنے کی سازشیں فیل ہوگئیں۔ علاقے کے ہندوؤں اور پولیس نے مسجد کے متاثرہ حصے کو دھلنے میں مسلمانوں کی مدد کی۔ بارسوخ ذرائع کے مطابق یہ کام علاقے کے کھٹکوں کا ہی ہوسکتا ہے کیونکہ مندر میں جانور پھینکنے کا جہاں تک تعلق ہے تو مسلمان خنزیر جیسے ناپاک جانور کو مندر میں کیوں پھینکتا ویسے بھی اگر کوئی مسلم غنڈہ ایسی حرکت کرتا تو وہ بھی خنزیر کے بجائے کوئی اور جانور ڈالتا۔ اطلاعات کے مطابق کھٹکوں کا تعلق شیوسینا سے ہے اس لئے ممکن ہے کہ الیکشن اور عیدالاضحی کے موقع پر فساد کرانے کی شیوسینکوں کی کوئی سازش رہی ہو۔ بہرحال اس وقت حالات قابو میں ہیں اور شرپسندوں کی فساد کرانے کی ایک مذموم کوشش ناکام بنادی گئی ہے۔ حالات کو قابو کرنے میں مسجد کمیٹی کے نائب صدر جمشید، متولی ڈاکٹر نسیم، ایم سلیم، وسیم احمد اور اسلم پرویز وغیرہ نے اہم رول ادا کیا۔

سیلم پور کی مسجد کے سامنے پولیس کا پہرہ

لاکھوں امریکی مسلمانوں کی اسلامی بیداری سے یہودی

مسلمانوں پر فائرنگ، مسجدوں کی بے حرمتی اور اماموں کو دھمکیاں دینے

امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد، ایک اندازے کے مطابق ۶۰ لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن مختلف ثقافتی اور لسانی گروپوں سے منسلک ہونے کی وجہ سے اس سے قبل ان میں وہ اتحاد نہیں تھا جس کا اسلام اہل ایمان سے تقاضا کرتا ہے۔ لیکن جس طرح مصیبت میں سبھی لوگ چھوٹے موٹے اختلافات کو بھلا کر متحد ہو جاتے ہیں، ایسا ہی کچھ امریکہ میں بھی ہو رہا ہے۔ دو واقعات نے خاص طور سے امریکی مسلمانوں کے اندر نہ صرف اتحاد پیدا کیا ہے بلکہ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں اپنا معاملہ امریکی عوام کی عدالت اور پریس میں پیش کرتے ہیں۔ یہ واقعات ہیں، المیہ بوسنیا اور اوکلوہوما بم دھماکہ جس کا شروع میں الزام بغیر تحقیق و ثبوت کے مسلمانوں کے سر رکھ دیا گیا تھا۔

بوسنیا کے مسلمانوں پر جو قہر و ستم ٹوٹا ہے اس کی بہت تفصیلی رپورٹنگ امریکی پریس نے کی ہے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی مصیبت کو دیکھ کر امریکی مسلمان بے چین ہو گئے۔ چنانچہ ان کی مدد کے لیے انہوں نے ایک تنظیم قائم کر لی جس نے پورے ملک میں مظاہروں کا اہتمام کرنے کے علاوہ بوسنیائی مسلمانوں کی مالی مدد کے لیے بڑے پیمانے پر فنڈ جمع کیے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں نے امریکی میڈیا کو بھی بہت سا مواد فراہم کیا۔ لیکن اس المیے سے خود امریکی مسلمانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہونچا۔ پہلے امریکی مسلمان مختلف فقہی، مسلکی، لسانی اور ثقافتی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور عام طور سے ان کے درمیان تعاون کم اور اختلافات زیادہ تھے۔

مگر بوسنیا کے المیے نے انہیں جزئی قسم کے اختلافات کو بھلا کر متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

دوسرا اہم واقعہ جس نے امریکی مسلمانوں کو متحد ہونے اور امریکی عوام کے سامنے اپنا معاملہ ماہرانہ انداز میں پیش کرنے میں مدد دی وہ اوکلوہوما کا بم دھماکہ ہے۔ گذشتہ سال اپریل میں ایک انتہا پسند عیسائی فرقے سے وابستہ ایک شخص نے اوکلوہوما میں ایک فیڈرل عمارت کو بم سے اڑا دیا تھا جس سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی امریکی پریس نے بغیر تحقیق و ثبوت کے مسلمانوں پر الزام رکھ دیا کہ اس دھماکے کے پیچھے انہیں کا ہاتھ ہے۔ خاص طور سے پریس نے اس خبر کو بہت مشتہر کیا کہ پولیس ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہے جو مغربی ایشیا کا دکھائی دیتا ہے۔ بس کیا تھا تمام ہی امریکی مسلمان مشتبہ ہو گئے اور انہیں طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی پریس کی اس الزام تراشی سے امریکی مسلمانوں پر کیا گزری اس کے بارے میں کم ہی لوگوں کو علم ہے۔ بم دھماکے کے کچھ ہی دنوں بعد، خاص طور سے جب یہ تقریباً واضح ہو چکا تھا کہ اس مجرمانہ حرکت کا ذمہ دار کوئی مسلمان نہیں ہے، واشنگٹن میں قائم کونسل برائے امریکی۔ اسلامی تعلقات نے ایک رپورٹ شائع کی جس پر امریکی پریس میں بھی کافی بحث ہوئی۔ اس رپورٹ کے مطابق بم دھماکے کی خبر عام ہوتے ہی کئی مسلمانوں کو امریکیوں نے زدوکوب کیا۔ کئی کو ہراساں کیا گیا، گالیاں اور دھمکیاں دی گئیں، چاقو زنی ہوئی اور ایک معاملے میں ایک مسلمان پر باقاعدہ گولی چلائی گئی۔ اسی طرح امریکیوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والے مسلمانوں کو بغیر ثبوت کے مجرم سمجھ کر ان کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ شروع کر دیا۔ مزید برآں مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی، یہاں تک کہ بعض مساجد جلادی گئیں۔ مقامی اماموں کو دھمکیاں دی گئیں اور نقاب پوش خواتین کو ہراساں کیا گیا۔
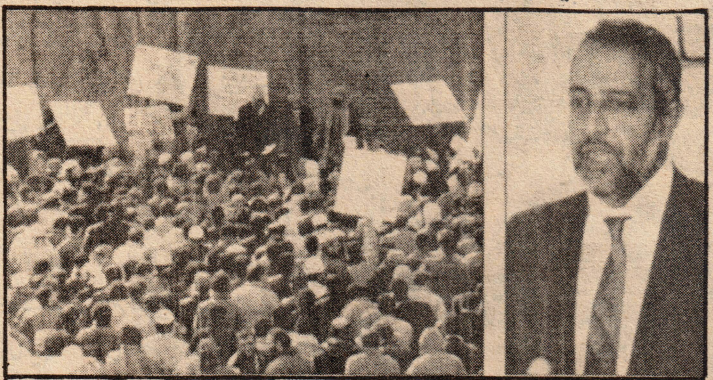
امریکی مسلم کونسل کے ڈائرکٹر عبدالرحمن العمودی

امریکی مسلمانوں کا احتجاجی مارچ

اس رپورٹ کو امریکی پریس نے بھی تسلیم کیا۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ بم دھماکے کے کچھ ہی دنوں بعد یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے عام امریکیوں کو اپنے اولیں رویے پر ذرا پشیمانی تھی۔ پھر بعض ان امریکی لیڈروں نے، جو عرب۔ امریکہ تعلقات کے حامی ہیں، ایسے بیانات دیے جن سے اعتدال کی ہوا چلی۔ ان سب کا اثر امریکی پریس پر بھی پڑا اور اپنے گناہ کے کفارے کے طور پر کونسل برائے امریکی۔ اسلامی تعلقات کی رپورٹ کو کافی اہمیت دی۔ اس کونسل کے ڈائرکٹر نہاد عوض سے کئی اخباروں اور ٹی وی چینلوں نے انٹرویو بھی لیا۔

کونسل برائے امریکی۔ اسلامی تعلقات کی رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ امریکی مسلمان اب جذباتی انداز میں الزام تراشی کرنے اور ہر مسئلے کو صیہونی سازش کہنے کے بجائے حقائق کی زبان میں بات کرنے لگے ہیں جو اب تک امریکیوں اور خاص طور سے یہودیوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یہ

بھی کہا جاسکتا ہے ... بنے وہیں کے تعلیم ... عالت سے بچوں ... مسلمانوں کو بھی امر ... کھیلنے کا گر آگیا ہے ... رہنماؤں کو بھی ... بڑی تنظیم اسلامک سو ... صدر عبداللہ ادریس ... آج کے امریکی مسلم ... پہلے کے گروہوں ... فرق نظر آئے گا۔ یہ ... ہے جس کا اہم مشاہدہ ... گروپ میں جو بھی ... بحیثیت مجموعی ہم پہلے ... امریکی مسلمانو ... عام ہو رہا ہے کہ ... باوجود بھی ان کا سیاسی

نومسلم باسکٹ بالر محمود عبدالرؤف کی للکار نے انھ

"میں اول و آخر صرف اور صرف ایک مسلمان ہوں۔ یہ (امریکی) پرچم ظلم و زیادتی اور استحصال کی علامت ہے۔ آپ ایک ساتھ خدا

> عبدالرؤف نہ صرف عملی مسلمان ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے بارے میں فکر مند بھی رہتے ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ اپنی پوری تاریخ میں ظلم و زیادتی کرتا رہا ہے۔ اس امریکی پالیسی اور رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے امریکی پرچم اور اس کے ترانے کے دوران احتراماً کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔

اور ظلم دونوں کے نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی ہدایت اس ضمن میں واضح ہے۔" یہ الفاظ محمود عبدالرؤف کے ہیں جنہوں نے ۱۹۹۱ء میں عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ سیاہ فام عبدالرؤف باسکٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ مذہبی انسان بھی ہیں۔ امریکہ میں بہت سے سیاہ فاموں نے احتجاجاً اسلام قبول کر لیا ہے مگر ان میں سے کم ہی ایسے ہیں جو اسلام کے تقاضوں پر پوری طرح عمل پیرا بھی ہوں۔ لیکن عبدالرؤف نہ صرف عملی مسلمان ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے بارے میں فکر مند بھی رہتے ہیں۔ انہیں حال ہی میں یہ خیال آیا کہ چیچنیا، بوسنیا اور دوسرے بہت سے مقامات پر مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے جن کے بارے میں امریکہ کی پالیسی یا تو غیر واضح رہی ہے یا مجرموں سے چشم پوشی کرنے کے مترادف رہی ہے۔ اسی طرح وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ اپنی پوری تاریخ میں ظلم و زیادتی کرتا رہا ہے۔ اس امریکی پالیسی اور رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے امریکی پرچم اور اس کے ترانے کے دوران احتراماً کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔ عبدالرؤف کے انکار کے بعد نیشنل باسکٹ بال ایسوسی ایشن (این۔ بی۔ اے) نے انہیں بغیر تنخواہ کے معطل کر دیا۔

این۔ بی۔ اے کے سکریٹری جنرل رس گرینیک نے عبدالرؤف کو معطل کرتے ہوئے کہا کہ مدت سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی میچ سے پہلے جب امریکی یا کنیڈین قومی ترانہ گایا جاتا ہے تو تمام کھلاڑی، کوچ اور دوسرے وابستہ افراد احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عبدالرؤف بھی پہلے ایسا کرتے تھے۔ لیکن اس سال انہوں نے ایسا کرنا ترک کر دیا۔

اس واقعے کے عام ہونے کے بعد امریکی پریس نہ صرف عبدالرؤف بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف روایتی ہرزہ سرائی پر اتر آیا۔ امریکی پریس کے رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبدالرؤف نے کہا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا اور اسے وہ اپنی ذات ہی تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ مگر پریس نے نہ صرف اسے ایک عوامی مسئلہ بنا دیا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز خیالات کا اظہار کیا جو قابل مذمت ہے۔

عبدالرؤف کا معاملہ جب روشنی میں آیا تو باسکٹ بال کے بعض سابق مشہور مسلمان کھلاڑیوں، مثلاً کریم عبدالجبار اور حکیم وغیرہ نے مداخلت کی۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ وہ عبدالرؤف کی مدد کریں گے۔ غالباً انہیں کھلاڑیوں کے مشورے پر عبدالرؤف نے اپنا موقف بدل دیا ہے۔ ... کہ عبدالرؤف امر ... دوسروں کے ساتھ ک

پوری دنیا میں بڑھتی مسلم آبادی کے

ایک مغربی اسکالر پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن بڑی شد و مد کے ساتھ اس پروپیگنڈے کی وکالت کرتے ہیں کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے اور اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو مختلف ممالک کے اصل باشندے ترک سکونت اور ہجرت پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں آر ایس ایس کے ترجمان پانچ جنیہ اور آرگنائزر نے پروفیسر ہنٹنگٹن کے اس پروپیگنڈے کا سہارا لیکر خوب واویلا مچایا ہے اور یہ بتانے اور جتانے کی کوشش کی ہے کہ مسلم آبادی کا خطرہ پوری دنیا پر منڈلا رہا ہے اور اگر اس خطرے سے نمٹا نہیں گیا تو زبردست مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن ریاض کی ایک تنظیم سے وابستہ معروف ماہر ماحولیات ایس فیضی نے ہنٹنگٹن کے اس دعوے کی اعداد و شمار کی روشنی میں قلعی کھول دی ہے۔ انہوں نے اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ صنعتی ممالک میں ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ آبادی ہے اور جہاں تک مسلم ممالک میں آبادی کا تناسب ہے وہ دوسرے ممالک کی بہ نسبت بہت کم ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک ہزار ہیکٹیر زمین پر مختلف ممالک میں آبادی کا تناسب اس طرح ہے۔ سوئٹزر لینڈ ۴۳۳۵، بیلجیم ۳۰۲۹، جاپان ۳۲۷۵، برطانیہ ۲۳۲۶، اسرائیل ۲۲۳۶، چین ۱۱۹۱، انڈونیشیا ۹۸۵، مصر ۵۱۶، ایران ۳۰۵، الجزائر ۱۰۴ اور کینیا ۳۲۸۔

ایس فیضی کے مطابق مغربی یوروپ میں آبادی کا تناسب افریقہ سے کہیں زیادہ ہے اور آبادی میں اضافہ کا مسئلہ دراصل یوروپ کا مسئلہ ہے۔ فیضی اس سے قبل ڈنمارک کی ایک

> دراصل اسلام پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے اور اس کی بالادستی قائم ہو گئی ہے اس لئے ہنٹنگٹن آبادی کے خطرے کا پروپیگنڈہ کر کے اسلام کے ... چھیڑے ہوئے ہیں۔

غیر سرکاری تنظیم گلوبل انوائرنمنٹل کے ورلڈ سکریٹری تھے۔ اس وقت وہ ریاض کے نیشنل کمیشن فار وائلڈ لائف کنزرویشن اینڈ ڈیولپمنٹ سے وابستہ ہیں۔ وہ اس مسئلے پر کئی عالمی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یوروپ میں ... میں آبادی میں بے پنا ... میں پوری دنیا کے ... سائنسدانوں کی اس ... کرتے ہیں کہ افریقہ ... آبادی کا تناسب شما ... ان کا کہنا ہے کہ اس ... کے سبب ہی یہ لوگ ... ہوا کھڑا کرتے ہیں۔ ... رسورسز انسٹی ٹیوٹ ک ... الجزائر، انگولا، اتھوپ ... سوڈان، بنگلہ دیش، انڈ ... نکاراگوا میں آبادی میں ... ممالک میں آبادی ... یہاں تک کہ کئی مس

دی ایوانوں میں لرزہ طاری ہوگیا ہے

ے دینے کے اقدامات سے مسلمانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی جارہی ہے

بھی کہا جاسکتا ہے کہ مدت سے امریکی سماج میں رہنے، وہیں کے تعلیم یافتہ ہونے اور وہاں کے حالات سے بخوبی آگاہ ہونے کی وجہ سے اب مسلمانوں کو بھی امریکی انداز سے سیاسی کھیل کھیلنے کا گر آگیا ہے۔ اس کا اندازہ امریکی مسلمان رہنماؤں کو بھی ہے۔ امریکہ کی سب سے قدیم اور بڑی تنظیم اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے صدر عبداللہ ادریس علی کہتے ہیں کہ "اگر آپ آج کے امریکی مسلم گروپوں کا مقابلہ دس برس پہلے کے گروہوں سے کریں تو آپ کو بہت زیادہ فرق نظر آئے گا۔ یہ ایک طرح کی اسلامی بیداری ہے جس کا ہم مشاہدہ کررہے ہیں۔ آج کئی مسلم گروپ ہیں جو بہت ہی اہم کام کررہے ہیں اور بحیثیت مجموعی ہم پہلے سے زیادہ متحد ہیں۔"

امریکی مسلمانوں میں اب یہ احساس بھی عام ہورہا ہے کہ ٦٠ لاکھ کی تعداد میں ہونے کے باوجود بھی ان کا سیاسی وزن بے معنی ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں سیاست پورے سماج کو متاثر کرتی ہے، سیاسی بے وزنی کس قدر خطرناک ہے، اب اس کا اندازہ امریکی مسلمانوں کو ہو گیا ہے۔

ایک بار مسلمانوں کا ایک وفد کیلی فورنیا کی سنیٹر ڈیانے فین اسٹائن سے ملنے گیا تو اس نے ملاقات سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ "میں ان لوگوں سے کیوں ملوں، یہ لوگ تو ووٹ ہی نہیں دیتے" ایک اندازے کے مطابق کیلی فورنیا میں مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔

اگر یہ تمام نہیں، بلکہ صرف ان میں سے پچاس ہزار متحد ہوکر کسی ایک امیدوار کے حق میں ووٹ دے دیں، اس کے ساتھ کام کریں اور اس

> عدلیہ، ایف بی آئی، سیاسی طبقے اور دوسرے گروہوں اور اداروں میں بھی نسل پرست اور مسلم دشمن عناصر موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے لیے مسئلہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ امریکی مسلمانوں کی بیداری سے یہودی لابی نہ صرف مضطرب بلکہ کافی سرگرم ہوگئی ہے۔

کی سوچ کو متاثر کریں تو اس سے نہ صرف امریکی مسلمانوں کا بلکہ دنیائے اسلام کا بھی فائدہ ہوگا۔ پہلے کیلی فورنیا کے مسلمانوں کو اپنی سیاسی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا مگر اب حالات تبدیل ہورہے ہیں۔ مسلمانوں میں بتدریج سیاسی بیداری آرہی ہے۔ وہ متحد ہونے کے ساتھ یہ بھی سیکھ رہے ہیں کہ امریکی سماج اور سیاست میں انہیں کس طرح اپنا رول ادا کرنا ہے۔

لیکن جہاں ایک طرف امریکی مسلمانوں میں بیداری پیدا ہورہی ہے وہیں دوسری طرف انکے لیے مسائل کھڑے کیے جارہے ہیں۔

عدلیہ، ایف بی آئی، سیاسی طبقے اور دوسرے گروہوں اور اداروں میں بھی نسل پرست اور مسلم دشمن عناصر موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے لیے مسئلہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ امریکی مسلمانوں کی بیداری سے یہودی لابی نہ صرف مضطرب بلکہ کافی سرگرم ہوگئی ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ مسلمانوں کو امریکی سماج میں سیاسی و معاشی اہمیت حاصل نہ ہو۔ یہودی لابی اور نسل پرست و مسلم دشمن امریکی خاص طور سے ان مسلمانوں کو نشانہ بنارہے ہیں جو تعلیم یافتہ۔ معتدل، غیر جذباتی اور سلجھے ہوئے ذہن کے ہیں۔ ایسے مسلمانوں میں سماجی کارکن بھی ہیں، سیاسی کارکن اور مسجدوں کے امام بھی۔ حماس کے معتدل سرگرم کارکن ابومرزوق کی گرفتاری دراصل انہیں عناصر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

لیکن سب سے اہم یہودی کامیابی اس وقت سامنے آئی جب امریکی پولیس نے ایک با اثر امریکی مسلم امام جمیل الامین کو ایک شخص پر گولی چلانے کے الزام میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا۔ بعد میں اس شخص نے جس پر گولی چلانے کا الزام تھا اپنا بیان یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ الامین کے خلاف پولیس اور ایف بی آئی نے یہ بیان جبراً لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود الامین ابھی تک جیل میں ہیں۔ جمیل الامین گذشتہ ١٩ سالوں سے کام کررہی نیشنل مسلم شوری کمیٹی کے رکن ہیں۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہ جلد ہی اس طاقتور کمیٹی کے صدر ہوجاتے۔ الامین اعتدال پسند، سلجھے ہوئے اور کافی مقبول امام ہیں۔ یہودی لابی اور مسلم دشمن امریکی عناصر کو اندازہ ہوگیا کہ شوری کونسل کے صدر کی حیثیت سے وہ کافی "خطرناک" ثابت ہوسکتے ہیں، اس لیے پولیس اور ایف بی آئی نے انہیں جھوٹے مقدمہ میں پھانس لیا۔

مگر ان اشتعال انگیز واقعات پر مسلمانوں کا ردعمل جذباتی کے بجائے ٹھوس حقائق کی بنیاد پر کافی سنجیدہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی پریس کے سنجیدہ اور غیر جانبدار صحافیوں نے اس کا نوٹس بھی لیا ہے۔ امریکی مسلمانوں کے معتدل لیڈروں اور سنجیدہ صحافیوں اور مبصرین کا خیال ہے کہ معتدل مسلمانوں کو ہراساں کرکے یا انہیں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل کر امریکی سماج گویا مسلمانوں میں انتہا پسندی کو ہوا دے رہا ہے۔ کیونکہ ان کے بقول مسلمان انتہا پسند جو امریکہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں، اب لوگوں کے پاس جاکر کہیں گے کہ اعتدال پسندی سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، اصل راستہ مسلح جدوجہد کا ہے جسے انہوں نے اختیار کررکھا ہے۔

نے انھیں امریکہ کا دوسرا محمد علی کلے بنادیا

موقف بدل دیا ہے۔ ان کھلاڑیوں کا مشورہ یہ ہے کہ عبدالرؤف امریکی ترانے کے دوران دوسروں کے ساتھ کھڑے ہوں لیکن وہ بذات خود اپنا ترانہ پڑھیں جس میں دنیا کے مظلوم مسلمانوں کے حق میں دعا کرنے کے ساتھ ظلم و زیادتی اور استحصال کی مذمت کریں۔ عبدالرؤف کو یہ مشورہ پسند آیا اور انہوں نے یہ قبول بھی کرلیا۔ جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی این۔ بی۔ اے نے عبدالرؤف کی بحالی کا حکم جاری کردیا۔

عبدالرؤف کے فیصلے سے ان کی ٹیم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دراصل وہ اپنی ٹیم کے سب سے اہم کھلاڑی ہیں۔ اگرچہ ان کی ٹیم نے اپنا آخری میچ ان کے بغیر بھی جیت لیا تھا لیکن آنے والے مقابلوں میں انہیں عبدالرؤف کی صلاحیتوں کی سخت ضرورت تھی۔ عبدالرؤف کا اپنی ٹیم سے ٤ سال کے لیے ٢٦ لاکھ ڈالر پر معاہدہ ہے۔ اس طرح انہیں ہر میچ کے لیے تقریباً ٣٢ ہزار ڈالر ملتے ہیں۔ ٦ فٹ سے ذرا اونچے قد کے عبدالرؤف اپنی ٹیم کی طرف سے سب سے زیادہ اسکور کرنے والے کھلاڑی ہیں اور ان کا شمار باسکٹ کے چند جانے مانے کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔

ٹیم کے لیے دوبارہ کھیلنے کے فیصلے کے بعد عبدالرؤف نے کہا کہ انہوں نے جو موقف اختیار کیا تھا وہ غلط نہیں تھا اور اب انہوں نے بعض ہمدردوں کے مشورے سے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بھی بالکل درست ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اپنے مسلمان بھائیوں سے گفتگو کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ احتجاج کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ "میں پہلے غلط نہیں تھا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ میں اس سے بہتر طریقہ اختیار کرسکتا ہوں۔ یعنی قومی ترانے کے دوران دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ کھڑا تو ہوں لیکن میرے لبوں پر ایسا نغمہ ہو جس میں دنیا کے مظلوم مسلمانوں کے لیے دعا کی گئی ہو۔"

امریکی پریس کی اسلام دشمنی کی تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "وہ لوگ مجھے نسل پرست ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور میرے فیصلے کو میرے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ایک

نسلی مسئلہ بنادیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اسلام کے بارے میں بھی رائے زنی کرنا ضروری سمجھا حالانکہ اسلام کے بارے میں ان کی معلومات صفر ہیں۔" عبدالرؤف نے حتمی انداز میں اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "جب تک میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے اعمال اسلام کے عین مطابق ہیں، تب تک میں اسی طرح عمل کرتا رہوں گا یہ سوچے بغیر کہ دوسرے لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔"

دی کے پروپیگنڈے کا پوسٹ مارٹم

ہے کہ یوروپ میں صنعتی انقلاب کے زمانے میں آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں پوری دنیا کے لئے ایک خطرہ پیدا ہوگیا۔ سائنسدانوں کی اس دلیل کو وہ لاعلمی پر محمول کرتے ہیں کہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں آبادی کا تناسب شمالی ممالک سے زیادہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں معلومات کی کمی کے سبب ہی یہ لوگ مسلم آبادی میں اضافے کا ہوا کھڑا کرتے ہیں۔ واشنگٹن کے ادارے ورلڈ رسورسز انسٹی ٹیوٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق

> ...تا جارہا ہے اور اکثر ممالک میں ...ں لئے ہنٹنگٹن جیسے مفکر اسلامی ... کے اسلام کے خلاف ایک مہم ...ے ہیں۔

الجزائر، انلولہ، اتھوپیا، مصر، کینیا، مراکش، سوڈان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ملیشیا، ہنڈورس اور نکاراگوا میں آبادی میں اضافے کا تناسب یوروپی ممالک میں آبادی کے تناسب سے کم ہے۔ یہاں تک کہ کئی مسلم ممالک میں آبادی کا تناسب عیسائی اکثریت والے ترقی پذیر ممالک سے بھی کم ہے۔

فیضی کے مطابق قدرتی وسائل کا استعمال بھی یوروپی اور ترقی یافتہ ممالک دیگر ممالک کے مقابلے میں زیادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک برطانوی خاندان جہاں صرف دو بچے ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر دنیا کے بیس خاندانوں کے برابر قدرتی وسائل استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح امریکہ جس کی آبادی پوری دنیا کا ٦.٥ فیصد ہے یعنی وہ پوری دنیا کی آبادی کا پانچ فیصد سے کچھ زائد ہے، ایلومینیم کا استعمال ٤٢ فیصد، کوئلے کا ٤٤ فیصد، کانسے کا ٣٢ فیصد اور اسی طرح دوسری چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ فیضی کا کہنا ہے کہ جب شمالی صنعتی سوسائٹی کا ایک ملک جس کی آبادی ٥ فیصد ہے قدرتی وسائل کا ٨٠ فیصد استعمال کرے گا تو پھر پوری دنیا کو خطرہ کس سے لاحق ہوگا اس سے یا کسی مسلم ملک سے۔ دراصل اسلام پوری دنیا میں پھیلتا جارہا ہے اور اکثر ممالک میں اس کی بالادستی قائم ہوگئی ہے اس لئے ہنٹنگٹن جیسے مفکر اسلامی آبادی کے خطرے کا پروپیگنڈہ کرکے اسلام کے خلاف ایک مہم چھیڑے ہوئے ہیں۔ ●

اسلامی ریاستوں کی بڑھتی طاقت سے روس کے کمیونسٹوں پر بوکھلاہٹ طاری ہوگئی ہے

کیا سابق جمہوریاؤں کو غلام بنا کر سوویت روس کو از سر نو زندہ کرنا ممکن ہے

چند سال قبل جب سوویت یونین کا زوال و انتشار ہوا اور ایک صدی سے زائد عرصے سے روسی قبضے میں جی رہی مسلم جمہوریائیں آزاد ہوئیں تو دنیا بھر کے مسلمانوں کو زبردست خوشی ہوئی تھی۔ یہ خوشی اس حد تک تو بجا تھی کہ مسلمان بالآخر ایذا پسند کمیونسٹ نظام سے آزاد ہوگئے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ ساری مسلم ریاستیں پورے طور پر اسلامی ہوکر عالم اسلام سے قریب آجائیں گی تو یہ غلط فہمی تھی۔ دراصل اکثر لوگوں کو سابق سوویت یونین کی صحیح صورتحال کا علم ہی نہیں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ حقیقت حال سے لوگ آگاہ ہونے لگے۔

سنٹرل ایشیا کے مسلم ممالک کے بارے میں یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ روسی زاروں اور کمیونسٹوں دونوں کے دور میں یہاں روسی نسل کے لوگوں کو ہمیشہ برتری حاصل رہی۔ گویا ۱۹ویں صدی سے ہی روسی نسل کے لوگ ان ممالک کے علاقوں میں آباد ہوگئے جو زیادہ تر زرخیز ہیں۔ کمیونسٹ نظام کے دوران جو صنعتی ترقی ہوئی اس میں ان مسلم ممالک کا حصہ بہت کم تھا اور جو صنعتیں قائم بھی ہوئیں تو ان پر روسی باشندوں کا قبضہ تھا۔ آج بھی صورتحال یہی ہے کہ ان سارے ہی مسلم آراضی اور صنعتوں میں روسیوں کا غلبہ ہے۔

اس روسی تسلط سے تمام ہی مسلم ریاستیں خائف نظر آتی ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر وہ اپنی حکومتیں چلانے سے قاصر بھی ہیں۔ پھر انہیں یہ بھی اندیشہ ہے کہ روس ان روسی اقلیتوں کے ذریعے یا تو ان کے لیے مسئلے پیدا کرسکتا ہے یا ان کے بہانے کھل کر مداخلت کرسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعض ریاستوں میں روس نے کھل کر مداخلت بھی کی ہے۔ حال ہی میں ڈوما یا روسی پارلیامنٹ کے ایوان زیریں میں سابق سوویت یونین کے احیاء اور تمام آزاد ریاستوں کو اس میں شامل کرنے سے متعلق جو تجویز پاس ہوئی ہے اس نے مسلم ریاستوں کے خوف میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اس اندیشے کے پیش نظر قزاخستان خاص طور سے ابھی سے پیش بندی کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔

کمیونسٹوں کی بوکھلاہٹ کا ایک نظارہ

اس ضمن میں قزاخستان کا پہلا قدم یہ ہے کہ ملک کا دارالحکومت الماتی سے اٹھا کر اکمولہ لے جایا جائے۔ بلاشبہ بہت سے بیوروکریٹ اور تاجر دارالحکومت کی اس تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن حکومت کے نقطہ نظر سے اب ایسا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ موجودہ دارالحکومت الماتی ملک کے ایک کنارے پر واقع ہے اور قزاخستان کا عظیم صحرا اسے پورے ملک سے تقریبا کاٹے ہوئے ہے۔ اکمولہ اس کے برعکس قزاخستان کے وسط میں واقع ہے اور شمالی قزاخستان کے ان شہروں سے بہت قریب ہے جہاں بھاری صنعتیں قائم ہیں اور جہاں تیل، گیس، سونا، پیتل اور دوسری معدنیات وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ملک کے اسی شمالی خطے میں زرخیز فارم بھی واقع ہیں۔ اس علاقے میں روسی کافی تعداد میں موجود ہیں اور اکثر مختلف صنعتوں میں روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق قزاخستان کی آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ ہے۔ روسی کل آبادی کا تقریبا ۳۶ فیصد ہیں اور ان کی بھاری اکثریت ملک کے شمالی حصے میں آباد ہے جہاں بھاری صنعتیں موجود ہیں اور جس کی سرحد روس سے ملتی ہے۔ قزاخستان کو اندیشہ ہے کہ اگر آئندہ صدارتی انتخاب میں یلتسن کو شکست ہوئی اور ان کی جگہ کوئی کمیونسٹ برسر اقتدار آیا تو شمالی قزاخستان کے روسی بغاوت کرکے روس سے ملنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ ایسے کسی بھی خطرے کو ٹالنے کی غرض سے ہی موجودہ حکومت، دارالحکومت اکمولہ لے جانا چاہتی ہے۔

اکمولہ کی آبادی اس وقت ۲ لاکھ ستر ہزار ہے۔ قازخ صدر نور سلطان نذر بائیوف کو امید ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یہ آبادی بڑھ کر پانچ لاکھ ہوجائے گی۔ شہر کو از سر نو تعمیر کرنے کا پروگرام ہے۔ ہوائی اڈے کو مزید بہتر بنایا جارہا ہے۔ ایک سفارتی خطے کی پہلے ہی نشاندہی کی جاچکی ہے اور مختلف حکومتوں کو بتایا جاچکا ہے کہ انہیں کس پلاٹ پر اپنا سفارتخانہ تعمیر کرنا ہے۔ نذر بائیوف کو امید ہے کہ ۱۹۹۸ء تک اکمولہ پوری طرح قزاخستان کا نیا دارالحکومت بن جائے گا۔

> حال ہی میں ڈوما یا روسی پارلیامنٹ کے ایوان زیریں میں سابق سوویت یونین کے احیاء اور تمام آزاد ریاستوں کو اس میں شامل کرنے سے متعلق جو تجویز پاس ہوئی ہے اس نے مسلم ریاستوں کے خوف میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ اس اندیشے کے پیش نظر قزاخستان خاص طور سے ابھی سے پیش بندی کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔

> قزاخستان کو اندیشہ ہے کہ اگر آئندہ صدارتی انتخاب میں یلتسن کو شکست ہوئی اور ان کی جگہ کوئی کمیونسٹ برسر اقتدار آیا تو شمالی قزاخستان کے روسی بغاوت کرکے روس سے ملنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ ایسے کسی بھی خطرے کو ٹالنے کی غرض سے ہی موجودہ حکومت دارالحکومت اکمولہ لے جانا چاہتی ہے۔

اسے مت پڑھیے

پچھلے دنوں امریکی ریاست سان فرانسسکو میں ہم جنسی کی علامتی دھنک رنگ جھنڈیوں سے آراستہ ایک بڑے تھیٹر میں منعقد اجتماعی تقریب میں ہم جنس مردوں اور عورتوں کے دو سو جوڑوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کیا۔ اس طرح کے جوڑوں کو قانونی طور پر رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے سے متعلق اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی یہ پہلی عوامی تقریب تھی۔ اس کا اہتمام ایک معزز و متمول شہری مسٹر مالیس نے کیا تھا جن کی چار ہم جنس جوڑوں سے گہری شناسائی ہے۔ مالیس نے خوشی کا جام ان جوڑوں کی طرف لہراتے ہوئے انہیں خوش و خرم اور کامیاب زندگی گذارنے کی دعا دی۔ ان کے مستقبل کی طرف سے پر امید مسٹر مالیس نے اس تاریخی تقریب کو اکیسویں صدی کے امکانات کی تمہید قرار دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تقریب کا افتتاح سان فرانسسکو کے میئر ولی براؤن اور سٹی سپروائزر کیرول مگڈن نے کیا۔ ان دو حضرات نے ہم جنس دولہوں اور دلہنوں کی خانگی رفیق کی قانونی حیثیت کے تسلیم کیے جانے کا اعلان کیا۔ کیرول مگڈن نے تو فرط مسرت سے یہ بھی کہا کہ خانگی رفاقت کو قانونی حیثیت دلانے کی کوششوں کے سلسلے کی یہ پہلی یقینی کڑی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ اس رشتے کو نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ قومی سطح پر بھی تسلیم کرلیا جائے گا۔

ایجاب و قبول کی اس رنگین اور سرشار محفل کا عجب سماں تھا جہاں مرد دلہنوں کے لب و رخسار سرخی و غازہ کی بہار دکھلا رہے تھے۔ ایک طرف بنے ہوئے اسٹیج پر باری باری ہر جوڑا آکر ایک دوسرے کے تئیں گہری انسیت اور محبت کا اظہار کرتا پھر ہاتھوں میں گلدستے اور ہاتھوں میں ہاتھ لیے نیچے اترتا۔ مسٹر مالیس نے ان کے جذبہ محبت کی "سنجیدگی" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس موقع پر یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر یہ سب ان کی نظر میں مذاق ہوتا تو اس "مقدس" تقریب میں شریک ہی نہ ہوتے۔

واضح رہے کہ سان فرانسسکو میں ہم جنسی زوجگی یا خانگی رفاقت قانونی طور پر ۱۹۹۱ سے جائز قرار دی جاچکی تھی لیکن اس رشتے کے اعلان کے لیے حلف وفاداری جیسی کسی رسمی تقریب کا انعقاد پہلی بار عمل میں آیا ہے۔ اب وہاں شہری قوانین کے تحت کوئی بھی ملازمت پیشہ مرد یا عورت اپنے ہم جنس رفیق کے ساتھ طبی سہولتیں حاصل کرسکتے ہیں اور ان میں سے کسی کی موت واقع ہوجانے کی صورت میں دوسرے رفیق کو رخصت سوگواری کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی کے بیمار پڑنے کی صورت میں دوسرے رفیق کو اسپتال میں ساتھ رہنے کی اجازت ہوگی جب کہ صرف خاندان کے افراد کو ہی یہ اجازت حاصل تھی۔ ۱۹۹۱ سے اب تک تین ہزار سے زائد جوڑوں نے خانگی رفیق کی حیثیت سے نیا رجسٹریشن کروایا ہے لیکن ابھی اس رشتے کو سرکاری یا قومی منظوری نہیں دی گئی ہے۔

> دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تقریب کا افتتاح سان فرانسسکو کے میئر ولی براؤن اور سٹی سپروائزر کیرول مگڈن نے کیا۔ ان دو حضرات نے ہم جنس دولھوں اور دلھنوں کی خانگی رفیق کی قانونی حیثیت کے تسلیم کیے جانے کا اعلان کیا۔ کیرول مگڈن نے تو فرط مسرت سے یہ بھی کہا کہ خانگی رفاقت کو قانونی حیثیت دلانے کی کوششوں کے سلسلے کی یہ پہلی یقینی کڑی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ اس رشتے کو نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ قومی سطح پر بھی تسلیم کرلیا جائے گا۔

"عروج آدم خاکی" کا ایک نمونہ

بقیہ ثقافتوں کے نام پر طوائفوں اور بھانڈوں کے مزے

کیا سیکھا۔ آرگنائزر نے کیا سبق حاصل کیا انہیں اس ہار پر کتنا دکھ ہوا۔ لیکن یہ خبریں اخبارات میں بھی شائع ہوئیں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی نشر کیں کہ اپنے ان ہیروز کی ناکامی کے بعد ملک میں بیسیوں افراد کو دل کے دورے پڑے، ہزاروں بوڑھے بچے اور خواتین دکھ سے رو پڑے۔ کتنے ہی لوگوں نے افسوس میں کھانا نہیں کھایا۔

اور اگر اپنے ہیروز کے اس سمجھ میں نہ آنے والے رویہ پر ان کے ہی مداح ان پر سٹے بازی میں ملوث ہونے کے یا دیگر الزامات عائد کریں تو اس میں کون سی بری بات ہے۔

شاید آصف زرداری کی سمجھ میں بھی اب یہ بات آگئی ہو کہ میچ جذبوں کی سچائی، محنت اور مہارت سے جیتے جاتے ہیں۔ روپے پیسوں کی للچ سے نہیں۔

خالدہ کے استعفے کے بعد بنگلہ دیش انتقامی سیاست کی گرفت میں

کیا شیخ حسینہ خالدہ کو پھانسی دلوانا چاہتی ہیں؟

کیا بنگلہ دیش میں پاکستان کی تاریخ دوہرائی جانے والی ہے اور کل تک برسر اقتدار خالدہ ضیا کو پاکستان کے معزول حکمراں ذوالفقار علی بھٹو کے حشر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کیا بنگلہ دیش کے سیاسی پہیے نے الٹی گردش شروع کردی ہے اور ۱۲ سال کی سزا کاٹ رہے سابق صدر جنرل حسین محمد ارشاد باہر اور خالدہ ضیا اندر ہونے والی ہیں۔ بنگلہ دیش کی حالیہ سیاسی سرگرمیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ایسے سوالات خود بخود سر اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بنگلہ دیش اپنے وجود سے لیکر آج تک سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کبھی شیخ مجیب الرحمن کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑا ہے تو کبھی ضیاء الرحمن کو۔ کبھی حسین محمد ارشاد کو انتقامی سیاست کی بھینٹ چڑھایا گیا تو کبھی دوسروں کو۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور کل تک احتجاجوں کے ذریعہ ملکی حالات کو تہ و بالا کرنے والی شیخ حسینہ واجد نے کارگزار حکمراں حبیب الرحمن بسواس سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ سبکدوش وزیر اعظم خالدہ ضیا کے خلاف مقدمات قائم کریں اور ان کی حکومت کے دوران انہوں نے اور ان کے رشتے داروں نے جو بد عنوانیاں کی ہیں ان پر سخت کارروائی کی جائے۔ ادھر خالدہ ضیا کا کہنا ہے کہ اگر ان سرکاری ملازمین کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی جو حزب اختلاف کے مظاہروں میں شامل تھے تو وہ زبردست عوامی احتجاج اور مظاہرے کرنے پر مجبور ہوجائیں گی۔ کارگزار حکمراں حبیب الرحمن بسواس جو کہ ملک کے صدر بھی ہیں اس کشمکش میں پھنس گئے ہیں کہ کیا کریں۔ گویا ابھی تک دو بیگمات آپس میں لڑرہی تھیں لیکن اب ان دونوں نے بالواسطہ طور پر اپنا تیسرا فریق بھی ڈھونڈ لیا ہے اور بسواس ان دونوں بیگمات کی سیاسی کارروائیوں اور مطالبات کی چکی میں پس رہے ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ بنگلہ دیش میں تقریباً ڈیڑھ سال سے عوامی احتجاج چل رہا ہے اور اس کی قیادت بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کی سربراہ حسینہ واجد کررہی ہیں۔ حسینہ واجد کی سرکردگی میں تقریبا تمام سیاسی جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ بنا ہوا ہے جو ایک ضمنی الیکشن میں خالدہ حکومت کے ذریعہ مبینہ بدعنوانی کی جانچ کے مطالبے کے تحت تحریک چلائے ہوئے تھا۔ اپنے مطالبات کو مزید زور دار بنانے کے لئے حسینہ کی قیادت میں

> حبیب الرحمن بسواس جو کہ ملک کے صدر بھی ہیں اس کشمکش میں پھنس گئے ہیں کہ کیا کریں۔ گویا ابھی تک دو بیگمات آپس میں لڑرہی تھیں لیکن اب ان دونوں نے بالواسطہ طور پر اپنا تیسرا فریق بھی ڈھونڈ لیا ہے اور بسواس ان دونوں بیگمات کی سیاسی کارروائیوں اور مطالبات کی چکی میں پس رہے ہیں۔

حزب اختلاف کے ممبران پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ سے اجتماعی استعفی دیدیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ خالدہ ضیا حکومت سے سبکدوش ہوجائیں اور ایک غیر جانبدار نگراں حکومت کی نگرانی میں عام چناؤ کرائے جائیں۔ خالدہ اس کو رد کرتی رہیں اور اپوزیشن اس مطالبے میں شدت پیدا کرتا رہا۔

اب خالدہ ضیاء تحریک چلائیں گی۔

خالدہ حکومت [illegible]

اسی درمیان خالدہ نے ایک دن اچانک عام انتخابات کا اعلان کردیا لیکن حکومت سے سبکدوش نہیں ہوئیں۔ اپوزیشن نے اس کو مسترد کردیا اور الیکشن میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کیا۔

بالاخر پولنگ کا دن بھی آگیا اور حزب اختلاف نے اپنے آپ کو الیکشن سے دور ہی رکھا۔ پولنگ ہوئی اور خالدہ ضیا کی پارٹی جاتیہ پارٹی نے اس یکطرفہ الیکشن میں زبردست اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ نئی حکومت کے قیام کے اگلے دن سے ہی پھر احتجاجوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اپوزیشن اپنے مطالبات پر ڈٹی رہی۔ اس دوران احتجاج نے عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی اور سرکاری ملازمین نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کردیا۔ سول نافرمانی کی تحریک بھی جاری ہوگئی اور احتجاج نے پرتشدد رنگ اختیار کرنا شروع کردیا۔ کئی لوگ ہلاک اور پولیس سے تصادم میں بے شمار زخمی ہوئے۔ لیکن نہ تو حزب اختلاف اپنے موقف سے ہٹی اور نہ ہی حزب اقتدار۔ کوئی بھی ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن جب سرکاری ملازموں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کردیا تو خالدہ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا اور ان کے لئے حکومت کا کام کاج مشکل ہوگیا۔ مجبورا اور تھک ہار کر انہوں نے استعفی دے دیا اور صدر حبیب الرحمن بسواس کو نگراں حکمراں بنادیا۔

لیکن بنگلہ دیش کی تقدیر اتنی جلدی بدلنے والی نہیں ہے۔ شیخ حسینہ نے نیا مطالبہ شروع کردیا ہے وہ چاہتی ہیں کہ خالدہ کے خلاف مقدمات قائم کرکے انہیں سزا دی جائے جبکہ خالدہ کا مطالبہ ہے کہ جو سرکاری ملازمین احتجاج میں شامل تھے ان کے خلاف کارروائی ہو۔ گویا دونوں انتقامی جذبے سے مغلوب ہیں اور ملک و عوام کے مفاد کی پروا کسی کو نہیں ہے۔ اگر پروا ہے تو صرف اپنے ذاتی سیاسی مفادات کی۔

بہرحال حالات ابھی بھی دگرگوں ہیں اگر بسواس نے دونوں کا مطالبہ تسلیم کرلیا تو بنگلہ دیش میں ایک بار پھر انتقامی دور کا آغاز ہوجائے گا اور اس انتقامی سیاست سے سب سے زیادہ نقصان خالدہ کو ہی اٹھانا پڑے گا۔ شیخ حسینہ کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ان کے پلڑے میں سیاسی کرنسی کا وزن بڑھتا جائے گا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ خالدہ کا زمانہ گیا اور حسینہ کا زمانہ آرہا ہے۔ بہرحال حالات سیاستدانوں کے حق میں جیسے بھی ہوں بنگلہ دیش کے حق میں اچھے نہیں ہیں۔

بے نظیر کے من مانے رویے کے نتیجے میں حکومت و عدالت میں ٹھن گئی ہے

ہندوستان میں کچھ عرصے سے عدالت عالیہ ملکی زندگی، خصوصا سیاست سے کرپشن کو ختم کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ ہوا سرحد پار کرکے پاکستانی عدالت عالیہ کو بھی متاثر کررہی ہے۔ پاکستانی عدالت کے ایک حالیہ فیصلے سے کچھ ایسا ہی تاثر ملتا ہے۔

پاکستان میں عدالت ہمیشہ فوجی آمروں اور سویلین ڈکٹیٹروں کے زیر اثر رہی ہے۔ اس کی آزادی پر ہمیشہ ڈاکے ڈالے گئے مگر اکثر اوقات یہ خاموش ہی رہی۔ لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی عدلیہ اپنی آزادی کے تحفظ اور انتظامیہ کے غیر ضروری اثر سے نکلنے کے لئے کمربستہ ہوگئی ہے۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلے سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔

دراصل پاکستان کی عدالتی و قانونی تاریخ میں اس وقت ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب عدالت عالیہ نے حکومت کے من مانے انداز میں ججوں کے تقرر کرنے کو انہیں ایک کورٹ سے دوسرے کورٹ میں ٹرانسفر کرنے یا ایڈہاک اور کارگزار ججوں کے تقرر کرنے کے حق پر پابندیاں عائد کردیں۔ بلاشبہ یہ پاکستانی عدلیہ کا ایک ایسا قدم ہے جو وہاں کی عدالتوں کو انتظامیہ کے غیر ضروری اثرات سے محفوظ رہ کر ان کی آزادی کو یقینی بنانے میں مدد دے گا۔

آج تک پاکستان کی ہر حکومت عدالت کی آزادی پر شب خوں مارتی رہی ہے۔ اگر کوئی جج کسی مقدمے میں حکومت یا اس کے کسی فرد کے خلاف فیصلے دیتا تو اس کا بلا وجہ بتائے ٹرانسفر کردیا جاتا اور اس کی جگہ ایسا جج مقرر کیا جاتا جس سے من چاہا فیصلہ لینا ممکن ہوتا۔ حکومت اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اکثر ججوں کی جگہ مستقل پر کرنے کے بجائے کارگزار ججوں کا تقرر کرتی اور اس طرح ان سے اپنی مرضی کے فیصلے حاصل کرلیتی۔ پاکستانی سپریم کورٹ نے حکومت کے اس اختیار پر یہ کہہ کر پابندی لگادی ہے کہ ججوں کا انتخاب اور تقرر چیف جسٹس کے مشورے سے ہوگا۔ یہی حکم ان کے ٹرانسفر پر بھی لاگو ہوگا۔

بے نظیر حکومت کو عدالت کے اس فیصلے سے کافی دھچکا لگا ہے۔ بظاہر انہوں نے اس فیصلے کو مان لیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس فیصلے کے اثرات کو محدود رکھنے کے لئے انہوں نے ایک قدم بھی اٹھایا ہے۔ اس اقدام کے ذریعے بے نظیر حکومت نے عدالت پر انتظامیہ کے اثر کو قائم رکھنے کے لئے ایک نئی ترکیب نکالی ہے۔ یعنی اب حکومت انتظامی مجسٹریٹوں کا تقرر کرے گی جو ڈپٹی کمشنر یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے تحت کام کریں گے۔ ظاہر ہے اپنے ان تقرر کردہ انتظامی مجسٹریٹوں سے حکومت اپنی مرضی کے فیصلے کم از کم نیچی سطح پر حاصل کرتی رہے گی۔

بے نظیر اپنی پسند کے ججوں کی تقرری چاہتی ہیں

لیکن حکومت کے اس اقدام کی پاکستان میں سخت مخالفت ہورہی ہے۔ فوج کے سربراہ اور صدر مملکت نے بھی اس اقدام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ غالبا یہی وجہ ہے کہ بے نظیر حکومت نے "انتظامی مجسٹریٹوں" کی تقرری ابھی تک نہیں کی ہے۔

ماہرین قانون بھی "انتظامی مجسٹریٹ" کے تصور کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عدالتی

> پاکستان کی عدالتی و قانونی تاریخ میں اس وقت ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب عدالت عالیہ نے حکومت کے من مانے انداز میں ججوں کے تقرر کرنے کے حق پر پابندیاں عائد کردیں۔

مجسٹریٹ اور نام نہاد انتظامی مجسٹریٹ کے درمیان ہمیشہ ایک قسم کی کشاکش رہے گی جس سے عدالت کا کام متاثر ہوگا۔ حکومت کی اس دلیل کو کہ "یہ انتظامی مجسٹریٹ ایک طرح سے فائر فائٹر کا کام کریں گے" قانون کے ماہرین نے یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ اس فائر فائٹنگ کے ذریعہ حکومت دراصل عدالت کو کسی نہ کسی بہانے انتظامیہ کے زیر اثر رکھنا چاہتی ہے۔

پاکستانی عدالت عالیہ کے حالیہ فیصلے کے بعد وہاں قانونی اور سیاسی حلقوں میں ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے حامیوں کے درمیان محاذ آرائی بھی شروع ہوگئی ہے۔ لاہور کی بار ایسوسی ایشن کے ایک جلسے کے دوران باقاعدہ ہاتھا پائی ہوئی اور پولیس نے نہ صرف مداخلت کی بلکہ لاٹھی چارج بھی کیا جس سے کئی وکلاء زخمی ہوگئے۔ ادھر نواز شریف کی قیادت میں ایک وفد نے صدر مملکت سے ملاقات کرکے یہ کہا ہے کہ وہ اس امر کو یقینی بنائیں کہ عدالت کا حالیہ فیصلہ نہ صرف نافذ ہوگا بلکہ تمام کارگزار ججوں کو فی الفور معطل کرنے کے ساتھ ان ججوں کا ان کی سابقہ جگہوں پر دوبارہ تقرر کیا جائے جہاں سے انہیں ان کے بعض حکومت مخالف فیصلوں کے بعد ٹرانسفر کردیا گیا تھا۔ اگرچہ اپوزیشن کا یہ مطالبہ اس کی اپنی سیاسی پالیسی کے تحت سامنے آیا ہے لیکن اس سے بہ انداز دیگر پاکستانی عدلیہ کی آزادی کی تحریک کو مزید تقویت ملے گی۔

مراسلات

کٹیہار میڈیکل کالج پر سپریم کورٹ کا فیصلہ قابل ستائش

ہم کٹیہار میڈیکل کالج کو بلاتاخیر الحاق دینے کی سپریم کورٹ کی طرف سے حکومت بہار کو ہدایت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ اقلیتی فرقہ کی ایک فتح ہے۔ صوبہ بہار میں مسلمانوں کو اعلاو جدید تعلیم سے نوازنے کا اقلیتی ادارہ کٹیہار میڈیکل کالج کو آج تک موجودہ حکومت نے بلا سبب منظوری نہیں دی تھی جبکہ اس کے انتظامیہ نے موجودہ حکومت اور میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا کی تمام مطلوبہ شرائط پوری کردی تھیں۔ کٹیہار میڈیکل کو منظوری دینے کے لئے مختلف مسلم ادارے اور تنظیموں کی طرف سے مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا لیکن موجودہ حکومت نہایت سرد مہری سے کام لیتی رہی جس سے سینکڑوں مسلم طلبہ اور ان کے گارجین سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا تھے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے اقلیتی فرقہ کے اندر حوصلہ بلند ہوا ہے اور وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد ہوں اگر سچی لگن اور ایمانداری کے ساتھ حق کی لڑائی لڑی جائے تو فتح حق کی ہی ہوگی۔ مونس تنظیم مطالبہ کرتی ہے کہ کٹیہار میڈیکل کالج کی بقا کی لڑائی کے لئے عدلیہ سے رجوع کرنے میں اقلیتی فرقہ کی جو رقم ضائع ہوئی ہے "جس سے اس ادارے میں جدید تکنیکی آلات مہیا کرائے جاسکتے تھے۔" اس کا ازالہ موجودہ حکومت کرے۔

محمد کمال الظفر۔ سربراہ مونس تنظیم۔ پٹنہ

اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا

آپ لوگ جس محنت و کاوش اور محبت سے ملی ٹائمز نکال رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ ایسا خوبصورت اور بامقصد پرچہ نکالنے پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اللہ آپ کو اس کی بہتر جزا دے گا۔ اور مزید ترقی سے نوازے گا۔ ہم اخبار کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن محدود وسائل کی بنا پر بہت زیادہ تعاون نہیں کرسکتے۔ البتہ کچھ دوستوں کو اس کا خریدار بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے پتے پر اخبار جاری کردیں۔ خط کے ساتھ ہی سالانہ چندہ ارسال کررہے ہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ مسلمانوں کو عزت دے اور آپ کو امت مسلمہ کی خدمت کی مزید توفیق بخشے۔ تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکیں۔

عبداللہ مسعود احمد قریشی

ال۔ نصر۔ سینٹر 8۔ لیڈر روڈ، سلاگ برکس، لندن

ملی ٹائمز کے ذریعے سعودی عرب میں ہندوستان کا نظارہ

میں سعودی عرب میں رہتا ہوں اور شروع سے ہی ملی ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ یہ اخبار مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کو مزید ترقی سے نوازے۔ کیونکہ یہ اخبار انتہائی مفید اور کار آمد اخبار ہے۔ اس میں نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی صورتحال پر بھرپور رپورٹ ہوتی ہے بلکہ مسلم دنیا اور عرب و اسلامی ممالک کے بارے میں بھی اچھی خاصی خبریں ہوتی ہیں۔ اس سے ایک تو ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے دوسرے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس خوبصورت پرچہ کو یوں ہی جاری رکھیں، اللہ آپ کو جزا دے گا۔ میں کچھ دوستوں کے پتے اور سالانہ چندہ بھیج رہا ہوں، آپ ان کو اخبار جاری کردیں۔ نوازش ہوگی۔

نور حسین۔ معرفت وسیم قریشی

پوسٹ بکس نمبر ۹۶۹۳۔ ریاض (سعودی عرب)

بہار میں اردو اسکولوں میں ہندی اساتذہ

بہار میں ٹیچروں کے بڑے پیمانے پر تبادلے اور اردو اسکولوں میں ہندی اساتذہ کی تقرری ایک سوچی سمجھی سازش ہے اور باعث تشویش ہے۔ اول تو اردو داں طلبا و طالبات کو جان بوجھ کر اردو میں درسی کتابیں ہی دستیاب نہیں کی جارہی ہیں طلبا و طالبات کے ساتھ ساتھ گارجین حضرات کو بھی طرح طرح سے پریشان کیا جارہا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بہار کی پوری مسلم آبادی بری طرح متاثر [illegible] کا مستقبل ہی تاریک نظر آرہا ہے۔

دوسری طرف سرکار کی جانکاری میں تقریبا پورے صوبہ میں اردو اسکولوں میں جن کی مادری زبان اردو ہے اور تمام کتابیں اردو ہی میں پڑھائی جارہی ہیں وہاں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندی داں اساتذہ کو بھیجا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں وزیر تعلیم بہار شری جے پرکاش یادو جی کا ایک بیان بھی آچکا ہے کہ اردو یونٹوں پر غیر اردو داں اساتذہ کے تبادلے کو درست کیا جارہا ہے لیکن ابھی تک معاملہ جوں کا توں ہے۔

موصوف نے کہا کہ کسی قوم کی زبان اس کے لئے ایک بڑی پونجی ہوتی ہے جس پر اس کی پوری تاریخ منحصر ہوتی ہے لہذا جس قوم کو تباہ کرنا ہوتا ہے تو پہلے اس قوم کی زبان چھین لی جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ سرکار بھی وہی کررہی ہے۔ کہنے کو تو یہ سرکار دلتوں، پچھڑے طبقات اور اقلیتوں کی سرکار ہے لیکن عمل بالکل ہی برعکس نظر آتا ہے۔

یہ سب صرف اس لئے ہورہا ہے کہ ہم میں سیاسی بیداری نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ دوسری قومیں روز بروز آگے کی طرف بڑھ رہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ اتنا ہی پیچھے جارہے ہیں۔ کاش کہ ہمارے نوجوان اس بات کو سمجھیں!

نعیم احمد۔ لنگر ٹولی۔ پٹنہ۔ بہار

بہار میں خفیہ پمفلٹ کی تقسیم

الیکشن قریب ہے اور بہار میں فرقہ پرستوں کی سازشیں شروع ہوگئی ہیں۔ سنگھ پریوار کی جانب سے خفیہ طور پر اپنے حلقوں میں ایسے پمفلٹ تقسیم ہورہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں تو فساد یقینی ہے۔ اس میں لکھی ہوئی چند باتیں اس طرح ہیں:

"فسادات میں مسلمانوں کے خلاف حملے ایسی جگہ سے کرو جو تمہارے اپنے علاقہ سے دور ہو تاکہ لوگ تم کو پہچان نہ سکیں، سامنے سے حملہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرو بلکہ ہمیشہ پیچھے سے وار کرو، رات کی تاریکی میں فساد کی آگ زیادہ بھڑکاؤ، مسلمانوں سے نہایت قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرو تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچاسکو، کسی بھی قیمت پر پولیس کو اس کا موقع نہ دو کہ وہ تمہارا اسلحہ پکڑ سکے، مسلمانوں کے یہاں جب کام کرو تو مزدوری ان کے گھر پر نہ لو بلکہ اس کو ایک نزاعی مسئلہ بنانے کی کوشش کرو، اگر مزدوری ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کو ایک نزاعی مسئلہ بنالو تاکہ لوگ تمہارے ارد گرد گلیوں اور راستوں میں جمع ہوجائیں اور پھر تمہیں ان کو ذلیل و رسوا کرنے کا موقع ملے، جب مسلمانوں کی دوکانوں سے سامان خریدو تو سامان کی صرف واجبی قیمت ادا کرو اور نفع بالکل نہ دو، اگر کسی وقت پولیس تحقیق کرے تو متضاد بیانات نہ دو، جس وقت بھی تمہیں کوئی معلومات حاصل ہو اسے تحریری شکل میں چندر کالا (کالا چاند) کا نشان لگا کر اپنے لیڈر تک پہنچادو، مسلمانوں کے گھروں میں کام کرتے وقت عورتوں کو رجھانے اور پھنسانے کی کوشش کرو اور موقع پاکر ان سے بدکاری کرو اس طرح مسلمان عورتوں سے ہندو نسل تیار ہوسکے گی، جو مسلمان عورتیں معذور یا ضرورت مند ہوں مجبوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں حاملہ کرنے کی کوشش کرو، جس وقت مسلمان عورتیں ولادت کے لئے اسپتال میں آئیں تو بچوں کے کانوں میں رام پڑھو، مسلمانوں کے کاروبار اور منافع کو کم سے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرو۔" اس طرح انتخابی ماحول کو فرقہ وارانہ رنگ دیکر زیادہ سے زیادہ ہندوؤں کو ورغلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اگر حکام نے توجہ نہیں دی تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

تسنیم بلخی۔ بہار شریف، نالندہ (بہار)

مسلمان متحد ہوجائیں تو کیا نہیں ہوسکتا

انتخابات ہورہے ہیں اور تمام پارٹیاں مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ عام اندازے کے مطابق مسلمان اس ملک میں ۲۰ کروڑ سے زائد ہیں اس طرح مسلمان ۱۰۰ کے قریب پارلیمنٹ کے ممبر بن سکتے ہیں یا پھر ان کی مدد کے بغیر ایک سو ممبر پارلیمنٹ میں نہیں جاسکتے ہیں۔ یہ تعداد ایک قابل لحاظ تعداد ہوگی۔ اپنے آئینی حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کا آپسی اتحاد ملک گیر پیمانے پر وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ہم کیا کریں:۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے اس کے لئے مسلم سیاسی رہنماؤں سے گذارش ہے کہ وہ اپنی اپنی پارٹیوں کے جھنڈے توڑ کر اپنے اپنے ہاتھوں میں ایک ایک لکڑی کا ٹکڑا لیکر آئیں اور سب ملکر ایک ایسا عصا بنائیں جس طرح حضرت موسی علیہ السلام کا تھا۔ اور انہوں نے جابر و ظالم حکمراں کے خلاف بطور ضرب کلیم استعمال کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دلائی تھی۔ اور ہمارے صحافی حضرات کو چاہئے کہ وہ ملت کی طاقت کو ابھاریں بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسی علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ تاکہ اپنی قوم کو نجات دلاسکیں۔

علمائے ہند سے بھی گذارش ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر ملت اسلامیہ ہند کی قیادت کرنا چھوڑدیں بلکہ اپنی اپنی فرقہ بندی کی کشتیوں کو توڑ کر سب مل کر ایک بڑی اور مضبوط کشتی بنائیں جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی تھی۔ تاکہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں ملت اسلامیہ ہند کا بیڑہ غرق ہونے سے بچ سکے۔ اس طرح توحید کی طاقت کو پھر سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

ڈاکٹر مرزا نذیر بیگ ہمنا بادی

ایوان شاہی۔ گلبرگہ

کھیل پر مضامین ضرور دیں

ملی ٹائمز دن بدن ترقی کرتا جارہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں اردو ہفت روزہ اخبارات کی کمی ہے۔ کمی تھی تو معیاری ہفت روزہ کی اور ہفت روزہ میں سیاسی مضامین کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ملی ٹائمز نے مسلم دنیا کے متعلق مضامین زیادہ شامل کرکے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ ایسے ہی مضامین زیادہ تعداد میں شائع کریں گے۔

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اظہرالدین کے متعلق پڑھ کر افسوس ہوا۔ ہر طرح کی برائیوں سے دور رہنے والا اظہر پتہ نہیں ایک ماڈل سے بنی ہیروئن کے چکر میں کیسے پڑگیا۔ اظہر کو پتہ ہونا چاہئے کہ اس طرح کی لڑکیوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا وہ پیار کسی اور سے کرتی ہیں شادی کسی اور سے اور مزے کسی اور سے۔ اس شمارہ میں ورلڈ کپ کے موقع سے آپ نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ برائے مہربانی ہر شمارہ میں کھیل کے متعلق ایک صفحہ ضرور شائع کیا کریں۔ باقی سبھی مضامین قابل ستائش ہوتے ہیں بس کھیل کے متعلق مضامین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

خدا اس اخبار کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

عبدالنور شبلی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

انتقال پر ملال

یہ اطلاع دیتے ہوئے انتہائی افسوس ہورہا ہے کہ آمبور میں ملی ٹائمز کے ایجنٹ جناب پی عبدالرزاق کا ۲۰ فروری کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالی انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

پی۔ ذاکر حسین ولد پی۔ عبدالرزاق مرحوم

جلال روڈ۔ آمبور

مظفر حسین مرحوم کو خراج عقیدت

گذشتہ دنوں امور میں دیہی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک رہائشی درسگاہ کے قیام پر غور کرنے کی غرض سے طلب کی گئی عام میٹنگ الحاج مولوی مظفر حسین (ایم ایل اے امور) کے ۱۴ مارچ کی درمیانی شب میں اچانک انتقال کرجانے کے باعث تعزیتی اجلاس میں بدل گئی۔ جس میں مظفر حسین کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

ایک قرار داد میں کہا گیا کہ ملی تنظیم نسواں نے وسائل کے فقدان کے باوجود اللہ تعالی پر توکل کرتے ہوئے دیہی اور غریب بچیوں کی تعلیم کے لئے ایک رہائشی ادارہ قائم کرنے کی غرض سے فی الوقت ڈھائی بیگھہ زمین حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور مجوزہ ادارہ کے لئے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل عمل میں آئی۔

اظہار ادیب

گنڈواس چوک، پوسٹ۔ ایم بیلگچھی

پورنیہ (بہار)

ایس آئی ایم کے نئے صدر

ایس آئی ایم کی مرکزی نمائندگان کونسل کی ایک میٹنگ احمد آباد میں ۲۹ فروری سے ۳ مارچ تک منعقد ہوئی جس میں عبدالبر اثری کو مارچ ۱۹۹۶ سے فروری ۱۹۹۸ تک کے لئے ایس آئی ایم کا قومی صدر منتخب کیا گیا۔ ان کا تعلق بہار سے ہے۔ انہوں نے جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ سے فضیلت کی ہے۔

شاہد اسماعیل

سکریٹری جنرل ایس آئی ایم آف انڈیا

ذاکر نگر۔ نئی دہلی

کانگریس بدعہد، بی جے پی فرقہ پرست، نیشنل فرنٹ بے سمت اور کمیونسٹ مسلم مسائل سے ناواقف

عام انتخابات میں مسلمانوں کے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری آن پڑی ہے

یہ کالم ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مسلم وغیر مسلم دانشوروں کے مضامین کے لیے وقف ہے۔ اس میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ایڈیٹر)

تحریر: پروفیسر محمد حسن

پرانی اور نئی یادیں اکثر دھندلی ہو جاتی ہیں۔ ان یادوں کی تجارت کرنے والے بھی بہت ہیں۔ انہیں انسان کی بھول پر پورا اعتماد ہے یوں نہ ہوتا تو آدمی بار بار دھوکا کیوں کھاتا۔ بار بار دوسروں کی چالاکیوں میں کیوں پھنستا۔ اس دھوکا دہی پر جتنا بھروسہ چالاک سیاست دانوں کو ہے اتنا تو شاید ٹھگوں اور ڈاکوؤں کو بھی نہ ہوگا۔

اب دیکھیے نا، ہماری آپ کی یاد کی بات ہے۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ بابری مسجد توڑ ڈالی گئی اور اس کی مخالفت میں کوئی ایک آواز بھی نہیں کے برابر اٹھتی رہی ہو بلکہ اس فتح مندی کے غرور میں شامل ہونے والوں میں یشونت سنہا سے لے کر شتروگھن سنہا تک اور نرسمہا راؤ سے لے کر اپنے وزیر داخلہ شری چوان تک بھی شامل تھے اور اب آج سب نہ سہی تو کم سے کم وزیر داخلہ تو یہ ضرور کہہ رہے ہیں کہ بقول شاعر:

قرآں اٹھا رہے ہیں کہ بندہ حسیں نہیں

بات کیا ہے؟ آخر یہ تبدیلی کیوں آرہی ہے؟ وجہ ہے آنے والا الیکشن!

پھر یہی نہیں، وزیر اعظم ہند (جو خیر سے ملک میں سب سے زیادہ عزت والا اور سب سے زیادہ اہم عہدہ ہے) لال قلعہ کے بلند و بالا منبر سے اعلان کر چکے ہیں بلکہ قوم کے سامنے کھلے عام عہد کر چکے ہیں کہ بابری مسجد کو اسی جگہ پر اور اسی طرح دوبارہ بنوائیں گے مگر اول تو یہ تھی طفل تسلی جیسے بچوں کو بہلانے کے لیے بڑی بوڑھیاں گانا گایا کرتی ہیں۔

انگنا میرے آجا چندا میاں رے

اور دوسرے یہ بھی غور طلب بات تھی کہ صدیوں پرانی تعمیر کو دوبارہ بنوا بھی دیا جائے تو اس کے قدیم نقش و نگار تو واپس نہیں آسکتے۔

اور اب پچھلے ایک برس سے تو ہمارے ماشاء اللہ مسلم نمائندگان جو حکومت میں شامل ہیں برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ "صاحب چھوڑیے کب تک اس قضیے میں الجھے رہیں گے۔ کوئی نیا راگ شروع کیجیے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچیے۔"

ٹیلی ویژن پر اب ایسے پروگرام بھی دکھائی دینے لگے ہیں جن میں مسلمانوں کی دلچسپی ہو۔ اب تک تو ٹیلی ویژن گویا بھارتیہ جنتا پارٹی کے دھرم یدھ کی نذر تھا حد یہ ہے کہ جو فلمیں دکھائی جاتی تھیں ان میں بھی صرف وہ فلمیں ہوتی تھیں جن میں دور دور تک کوئی "مسلم" کردار تو کجا اداکار تک نہ ہوتا۔

ایک طرف ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر پرانے دور کی متحدہ قومیت اور باہمی پیار محبت کی دہائی دیجیے دوسری طرف مسجدوں کے امام اور دیگر مذہبی رہنماؤں کو پنشن یا اس کے سبز باغ دکھائیے تیسری طرف حکومت کے مسلم وزیروں کو گھمائیے پھرائیے چوتھی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسے شاندار وعدے وعید کیجیے جنھیں پورا کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو۔

یہ سب باتیں اس نیت سے کی جارہی ہیں کہ مسلم اقلیت پھر گمراہ ہو کر اس جماعت پر بھروسہ کرلے جو ان کی تحقیر اور تذلیل کے لئے ذمہ دار ہے کہ انہیں پھر سے اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے مگر آخر یہ منفی باتیں کب تک! فرض کیجیے کہ آپ کے علاقے میں ایک بھاجپائی ذہنیت والے کانگریسی امیدوار کا مقابلہ ایک فرقہ پرست بھاجپائی سے ہو گیا آپ دونوں امیدواروں میں سے کسی ایک کو تو ووٹ ضرور دیں گے۔ سو کس کو!!! اور کسی کو ووٹ نہ دیں گے تو گویا آپ اپنا ہی نقصان کریں گے (یہ تجربہ بھی پچھلے الیکشن میں مسلم مجلس والے کر کے دیکھ چکے ہیں اس سے صرف غیریت کا احساس بڑھتا ہے) تو پھر راستہ کیا ہے؟

اب پچھلے ایک برس سے تو ہمارے ماشاء اللہ مسلم نمائندگان جو حکومت میں شامل ہیں برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ "صاحب چھوڑیے کب تک اس قضیے میں الجھے رہیں گے۔ کوئی نیا راگ شروع کیجیے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچیے۔"

راستہ صرف یہ ہے آپ صورت حال کے از خود سامنے آنے کا انتظار نہ کریں بلکہ ہو سکے تو ایسے امیدوار آج ہی سے نظر میں رکھیں اور انہیں حوصلہ اور امداد دیں جو آپ کے نزدیک دیانتداری اور خلوص سے "سیکولر" ہیں۔

آئیے اب ذرا اپنے ملک میں ان سیاسی پارٹیوں کے حسب نسب پر ایک نظر ڈال لیں بقول شاعر۔

راستہ صرف یہ ہے آپ صورت حال کے از خود سامنے آنے کا انتظار نہ کریں بلکہ ہو سکے تو ایسے امیدوار آج ہی سے نظر میں رکھیں اور انہیں حوصلہ اور امداد دیں جو آپ کے نزدیک دیانتداری اور خلوص سے "سیکولر" ہیں۔

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

پہلے کانگریس دوسرے جنتا دل اور نیشنل فرنٹ تیسرے کمیونسٹ پارٹیاں اور چوتھے کانشی رام کی بی ایس پی پانچویں بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیوسینا اور چھٹے مسلم لیگ اور مسلم مجلس وغیرہ۔

پہلے کانگریس کو لیجیے۔ کچھ آج سے نہیں تقسیم ہندوستان سے لے کر آج تک کانگریس کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ عملاً تو وہ ہندو اکثریت کی بولی بولتی ہے اور نظریاتی طور پر وہ سیکولرزم کی دم بھرتی ہے حد یہ ہے کہ اس نے سیکولرزم کی بھی ایک ایسی تعریف اپنے طور پر وضع کرلی ہے جس میں اس کی فرقہ واریت اور اکثریت کے دھرم کی پیروی کا جواز نکل آئے۔ دنیا بھر میں سیکولرزم سے کسی قسم کے مذہب اور دھرم سے لاتعلقی مراد لی جاتی ہے۔ بھلا ہو پنڈت نہرو اور ہمارے ملک کے آئین سازوں کا کہ انھوں نے سیکولرزم کا مطلب یہ نکالا کہ حکومت ہر مذہب اور دھرم کا احترام کرے گی اس میں اتنا اور اضافہ ہو گیا کہ اکثریت کے مذہب اور دھرم کے ماننے والوں نے اپنے مذہبی رسوم کی ادائیگی بھی شروع کردی اور اسے حکومت نے خود اپنے چلن کے طور پر قبول کرلیا۔ مثلاً جہاز تیار ہو تو اس پر ناریل پھوڑا جائے۔ ہر فوجی چھاؤنی میں مندر بنایا جائے گویا سیکولرزم کا مطلب صرف اتارہ گیا کہ حکومت وقت کا مذہب اور دھرم تو وہی ہوگا جو ملک کی اکثریت کا ہے البتہ اقلیتوں کو بھی اپنے اپنے مذہب کی پاسداری کی اجازت ہوگی۔

خیر یہ تو اصولی بات ہے عملی طور پر کانگریس میں ہندو فرقہ پرستوں کی گھس پیٹھ پرشوتم داس ٹنڈن کے زمانے سے برابر جاری ہے جن کے کانگریس کے صدر منتخب ہو جانے کے خطرے پر جواہر لعل نہرو نے برہم ہو کر خود کانگریس کی صدارت قبول کی تھی۔ یہ کہانی لمبی ہے مگر ادھر بابری مسجد قضیے کے بعد سے ہندو فرقہ واریت میں جو ابھار آیا ہے اس کے زیر اثر کانگریس کے اندر کٹر رجعت پسند اور دھارمک فرقہ پھر ابھر آیا ہے اور اب کانگریس نام کو تو سیکولر پارٹی ہے مگر درحقیقت اس کی نوعیت اب فرقہ وارانہ پارٹی ہی کی ہو گئی ہے سب سے بڑا ثبوت وہ ڈھلمل طرز عمل تھا جو کانگریس کی مرکزی حکومت نے بابری مسجد کے انہدام کے سلسلے میں اپنایا نرسمہا راؤ جی اس میں برابر کے شریک رہے چوان صاحب عین اس وقت بھگوان کا بھجن کرتے رہے اور عدالتیں خاموش رہیں۔ بقول شاعر:

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

کانگریس کے بعد سیکولر پارٹیوں میں سب سے اہم ہے جنتا دل یا یوں کہئے نیشنل فرنٹ۔ نیشنل فرنٹ نے ایک بار کانگریس کو ہرا کر کچھ دن دو مختلف بلکہ متضاد پارٹیوں کی مشترکہ حمایت سے مرکز میں حکومت بنائی بھی تھی اور چلائی بھی تھی مگر جن متضاد پارٹیوں کی حمایت اسے حاصل تھی وہ تھیں بھارتیہ جنتا پارٹی اور کمیونسٹ پارٹیاں اور بابری مسجد کے معاملے کو جب بھارتیہ جنتا پارٹی نے اٹھایا اور پرانی حمایت کو مشروط کردیا تو وی پی سنگھ سرکار نے استعفی دے دیا (ویسے استعفی دینا وی پی سنگھ کا سیاسی مشغلہ رہا ہے) مگر اس سے دراصل کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

اول تو وی پی سنگھ کی جنتا پارٹی کو غیر مشروط اکثریت ہی حاصل نہ تھی اور ان کی حکومت گویا کمیونسٹ پارٹیوں اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی مشترکہ مدد ہی پر قائم تھی اس لئے ان پالیسیوں پر اسی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیے حکومت کے باہر رہ کر بھی انہیں برابر اندرونی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا اور آج تک ان کی کوئی واضح مثبت پالیسی بن نہیں پائی ہے ایک طرف پٹنائک ہیں جو اڑیسہ کے وزیر اعلی رہے اور ہر قسم کے نظریاتی اور مالیاتی الجھاؤں میں الجھے رہے تو دوسری طرف لالو پرساد یادو ہیں جو سیکولرزم اور جمہوری اقدار کے محافظ کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔

جنتا دل کی حمایت صرف اسی صورت میں کی جانی چاہیے جب اقلیتیں اور بالخصوص مسلمان اس جماعت سے خاطر خواہ اطمینان حاصل کرسکیں اور یہ اطمینان محض دکھاوا نہ ہو بلکہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔

اس کے بعد دونوں کمیونسٹ پارٹیاں ہیں ایک زمانہ وہ تھا جب کمیونسٹ پارٹیوں میں مسلم لیڈروں کی بہت بڑی تعداد تھی اور وہ اپنی خاندانی صورت حال اور خود اپنے تجربوں سے اقلیتوں کے مسائل کا تجربہ رکھتے تھے آج حالت اس کے بالکل برعکس ہے خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (سی پی آئی) میں سوائے اکا دکا لیڈروں کے کوئی ایسا رہنما باقی نہیں ہے جو ان مسائل کی واقفیت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ پارٹیوں سے اتحاد اور ان کی حمایت کی بنیاد بھی باہمی افہام و تفہیم پر ہی ہوگی اور یہ ایسے مسئلوں پر ہونا چاہیے جن پر ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو اتفاق ہو۔

وقت ایسا ہے کہ حوالہ معاملے نے سب کو بے نقاب کردیا ہے۔ جو باقی بچے ہیں ان میں سے بھی اکثر کو بابری مسجد کے معاملے میں ان کی منافقت یا کھلم کھلا مخالفت نے ننگا کردیا ہے کچھ ایسے بھی ہیں جو خوشامدی اور جاہ پرستی کے سلسلے سے رسوا ہو چکے ہیں۔ سوال اب صرف یہ ہے کہ کیا ہندوستانی مسلمان ملک کے سیکولر عناصر کی مدد سے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں کیونکہ جب تک ملک کے سیکولر عناصر خود کسی قسم کے اتحاد تک نہ پہنچیں اور عام انتخاب سے قبل نہ پہنچیں اس وقت تک ملک اور قوم فرقہ واریت اور افتراق کے طوفان سے باہر نہ نکل پائے گی۔

ملک نے ۱۹۴۷ء کے بعد سے آج تک براہ راست فرقہ پرستی کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ شیاما پرساد مکرجی سے لے کر دین دیال اپادھیائے تک اسی نقطہ نظر کو قوم کے سامنے پیش کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہوئے اٹل بہاری باجپئی اور لال کرشن آڈوانی کو کامیابی ملی اور ہندوستانی مسلمانوں کو خاک اور خون میں لٹانے کے بعد ملی اور اس لوٹ میں شیوسینا سے لے کر سنگھل کے گروہ تک سبھی شامل رہے۔ آخر ملک میں جمہوری رائے عامہ اس قدر کمزور نہیں ہے کہ عام انتخابات میں ایک متحدہ فیصلہ نہ لے سکے مگر اس فیصلے تک پہنچنے اور ملک کی رائے عامہ کو پہچانے کی ذمہ داری اقلیتوں کو اور بالخصوص ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہندوستانی مسلمانوں کو قبول کرنی چاہیے کہ سیاست محض حقوق ہی کا نام نہیں اس سے کہیں زیادہ فرائض اور فرض شناسی کا نام ہے۔

اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم سب نے اپنی موت بلالی ہے"

امریکہ کے سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ مطلوب ایک ایسے مجرم کی کہانی جس نے اپنی سرگرمیوں سے پورے امریکہ کو نشے باز بنانے کا عہد کر رکھا تھا

میکسیکو میں چل رہی انسداد منشیات فروشی کی مہم میں گارشیا ابرگو کا نام انعامی تختے یا ٹرانی سے کم اہم نہیں۔ امریکہ میں اسمگل ہونے والی کوکین اور دیگر منشیات کی مجموعی مقدار کا ایک تہائی حصہ صرف ابرگو کے ذریعے وہاں پہنچتا ہے۔ گذشتہ دس سال سے کولمبیا اور امریکہ کے درمیان منشیات کی ہیرا پھیری کرتے ہوئے وہ کچھ بڑے شہروں کو ان کے اثرات سے مسموم کرکے اس دھندے سے دو ملین ڈالر سالانہ کی آمدنی کرچکا ہے۔ اس کاروبار کو کامیابی سے چلانے کے مقصد سے وہ ہر ماہ بدعنوان افسروں کی مٹھی گرم کرنے کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ کرتا تھا اور اسی لئے حکومت و قانون کے شکنجے سے بچا رہا۔ لیکن یہی رشوتیں اس کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہوئیں۔ اس کی جیب میں پڑی ہوئی سرکاری عہدیداران کی فہرست اور ان کے پتوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا۔

اسی سال چودہ جنوری کو میکسیکو کی ایک انسدادی ٹیم نے ابرگو کا سراغ ملنے پر ایک مویشی گاہ پر چھاپا مارا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ وہ اس اچانک حملے کی تاب نہ لاسکا اور انسدادی ٹیم نے پوری طرح اس پر قابو پالیا۔ گرفتار کرکے اسے میکسیکو میں نہیں رکھا گیا بلکہ عام قیاس آرائی کے برعکس امریکہ لایا گیا جہاں منشیات کے دھندے، ناجائز دولت کے ہیر پھیر اور قتل جیسے سنگین جرائم کے معاملات میں پولیس کو مطلوب تھا۔ بلکہ ایف بی آئی کی دس نامی ترین مجرموں کی فہرست میں اس کا نام شامل تھا۔ گویا کہ بدکرداروں کی اس کہکشاں میں وہ دنیا کا پہلا منشیات فروش تھا جسے ایف بی آئی نے یہ "اعزاز" بخشا۔ تصور کیجئے کہ ایک دولت مند، ثروتمند اور بارسوخ مجرم کو جب ایف بی آئی ایجنٹ میکسیکو ہوائی اڈے پر کار سے اتار کر گھسیٹتے ہوئے جہاز تک لے گئے تو وہ اس کا کیا عالم ہوا ہوگا۔ اس نے افسران پر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ ایک نگاہ ڈالی اور کہا "تم سب نے اپنی موت بلالی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ گارشیا ابرگو کو میکسیکو سے امریکہ منتقل کرنے کا ایک بڑا سبب میکسیکو کے سرکاری عہدیداران تک اس کی رسائی ہے۔ مقامی ذمہ داران کا کہنا ہے کہ انہیں اپنے رسوخ کے بل بوتے پر حراست میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے گرگوں کی مدد سے خفیہ طور پر منشیات کا دھندہ میکسیکو میں کرتا رہے گا کیونکہ اس کے نمک خواروں کی فہرست میں پولیس افسران اور وزراء کابینہ جیسے پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں اسی لیے اس بات کا اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جوش وفاداری میں ابرگو کے سیاہ ناموں کو طشت از بام نہ ہونے دیں۔ اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ میکسیکو سے بدعنوانی کو جڑ سے اکھاڑنے کا جو عہد میکسیکو صدر نے کیا ہے ابرگو کا اخراج اسی کی ایک کڑی ہے۔ میکسیکی ذمہ داران کا کہنا ہے کہ امریکہ میں جب ابرگو پر مقدمہ چلایا جائے گا تو کئی حقائق سامنے آئیں گے اور کئی افراد کے چہروں سے نقاب ہٹے گا۔

اس امکان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں سابق میکسیکی صدر سالنیاس اور ان کے بھائی راول بھی آجاتے ہیں جنہیں صدر زیڈیلو کے انتخاب کے بعد رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ راول کو بنیادی طور پر برسراقتدار انسٹی ٹیوشنل رولیشنری پارٹی کے سکریٹری جنرل کے قتل کے جرم میں ماخوذ ہونے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کا رابطہ ابرگو کے گروہ سے بھی بتایا جاتا ہے جو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ جان لینے کے بعد کہ سانیاس کے دور صدارت میں اس نے منشیات فروشوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس شبہ کو یقین کی طرف لے جاتا ہے۔

منشیات کی تجارت کے دو اہم رخ ہیں۔ ایک پہلو تو ہے اربوں روپیہ سمیٹنے کا اور دوسرا پہلو ہے اس دولت کو آگے مزید کسی جائز کاروبار میں لگانے کا۔ (ہر ناجائز کاروبار کی بنیادی حکمت عملی یہی ہوتی ہے) اور اس کام میں گارشیا ابرگو کو ملکہ حاصل ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ٹنوں کے حساب ناجائز نقدی کو اصل ذرائع کا انکشاف کیے بغیر کیسے مالی نظام کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۹۴ میں منظر عام پر آنے والے ہیرا پھیری کے ایک واقعے سے جس میں اس کا بڑا ہاتھ تھا اس طریقہ کار کی پیچیدگی کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ امریکہ میں کمائی ہوئی دولت میکسیکو منتقل کرکے ایک مانیٹری کرنسی ایجنسی کے حوالے کردیا گیا۔ وہی پیسہ اس ایجنسی کے ذریعے دوبارہ امریکہ آگیا اور میک ایلن ٹیکساس کے ایکسچینج اکاؤنٹ میں جمع ہوگیا۔ پھر کیلی فورنیا میں امریکن ایکسپریس بینک انٹرنیشنل کی مدد سے کیمن آئی لینڈ کے مین ہٹین اکاؤنٹس میں منتقل ہوگیا۔ وہاں سے یہ پیسہ مختلف تجارتوں میں لگ گیا۔ اس واسطہ در واسطہ طریقہ کار سے یہ ہوا کہ اربوں کی دولت ٹیکس اور قانون کی گرفت سے بچی رہی اور اسے جائز رتبہ بھی مل گیا۔ گرفتاری پر بہت سے اندازے قائم کیے جارہے ہیں مثلاً یہ کہ یہ اس کی گرتی ہوئی شہرت کو اٹھانے کی کوشش ہے۔ تاہم اس کی گرفتاری سے میکسیکو سے منشیات آنے کا دھندہ بند ہونے والا نہیں ہے کیونکہ اس کا ایک اور ہم پیشہ اماڈوے کیریلو، ٹن کوکین لیے بیٹھا ہے جو نہ جانے کب لاس انجلز کی سڑکوں پر انڈیل دے

گارشیا ابرگو ایف بی آئی ایجنٹوں کی گرفت میں

بقیہ: دراندازوں کے بہانے آسامی مسلمانوں کے خلاف

خاموشی اختیار کرکے ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ کرنا ہے۔ جبکہ آسو کے موجودہ لیڈران ان دونوں لیڈروں کے نقش قدم پر چل کر خود اقتدار میں آنے کے خواہاں ہیں۔ گویا ایک طرح سے یہ تحریک دراندازی کی آڑ میں سیاسی مفاد پرستی کی تحریک ہے۔ بی جے پی بھی اس میں شامل ہے لیکن وہ صرف مسلم "دراندازوں" کو ملک سے نکالنے کی وکالت کرتی ہے۔ وہ ہندو دراندازوں کی پرزور حامی ہے اور انہیں درانداز کے بجائے پناہ گزیں کہتی ہے۔ ادھر برسراقتدار کانگریس جماعت اس معاملے پر آسو مخالف موقف اپنا کر مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرکے وہاں اپنی حکومت برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ گویا دراندازی کی آڑ میں سیاسی کھیل پوری شدت سے کھیلا جارہا ہے اور مسلمان اس کا مہرا بنا ہوا ہے۔

دراندازی مخالف تحریک کا آغاز ۱۹۷۹ میں ہوا تھا۔ ۸۵ تک اس نے پوری ریاست میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ لیکن راجیو گاندھی حکومت سے معاہدہ کے بعد اس کا زور کم ہوگیا اور پھر اس میں ملوث لیڈر برسراقتدار آگئے۔ ۹۰ کے بعد پھر اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی اور عدالتوں میں مقدمات قائم کیے گئے۔ زیریں عدالتوں سے لیکر سپریم کورٹ تک معاملہ چلا اور بعض مقدمات میں الیکشن کمیشن اور مسلم جماعتوں کو کامیابی ملی۔ اس درمیان الیکشن کمیشن نے اعلان کیا کہ ۹۲ کی ووٹر لسٹ کی بنیاد پر لوگوں کو فوٹو شناختی کارڈ بنوانے اور ووٹ دینے کا حق دیا جاتا ہے لیکن آسو نے اس کی مخالفت کی اور اس نے شناختی کارڈ بنوانے میں رخنہ اندازی کرکے بیشتر مسلمانوں کے کارڈ نہیں بننے دیے۔

آسو کا الزام ہے کہ آسام میں درانداز مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ اکثریت اور نسلی آسامی اقلیت میں ہوتے جارہے ہیں۔ جبکہ ان کے دعوے اکثر مواقع پر بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔ انکوائریوں میں بھی ان کا دعوی غلط ثابت ہوا ہے اور مسلم جماعتوں کے موقف کی تائید ہوئی ہے۔ متحدہ اقلیتی محاذ کے سکریٹری جنرل ایچ آر اے چودھری کا کہنا ہے کہ آسام گن پریشد ۱۹۸۶ سے ۱۹۹۱ تک برسراقتدار رہی اس درمیان اس نے مسلمانوں کو کھدیڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو ہراساں کرنا تھا پھر بھی اسے کامیابی نہیں ملی۔

انتخابی تاریخوں کے اعلان کے بعد آسام میں فرقہ واریت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے آسو نے لوگوں کو ورغلانے اور اس ایشو کو گرمانے کا عمل تیز کردیا ہے۔ لیکن برسراقتدار سائکیا حکومت مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھارہی ہے۔ اگر حالات کو یوں ہی ہاتھوں سے جانے دیا گیا تو کوئی تعجب نہیں کہ ایک اور نیلی جنم لے لے اور مسلمانوں کو پھر گاجر مولی کی مانند کاٹ دیا جائے۔

بقیہ: آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

طواف وداع کرلینے کے بعد اگر کوئی مکہ مکرمہ میں خاصی دیر رہ جائے تو اسے طواف وداع دوبارہ کرنا چاہیے۔ اس لئے اگر کوئی شخص دس یا گیارہ ذوالحجہ کو طواف وداع کرتا ہے تو یہ غلط ہوگا کیونکہ اسے کم از کم بارہ ذوالحجہ کی دوپہر تک رمی کے لئے رکنا ہی ہے۔ تاہم اگر کسی کو ہنگامی صورت حال کے تحت نکلنا ہی ہے اور وہ اپنی طرف سے رمی کرنے کے لئے کسی کو مقرر کردیتا ہے تو ان تاریخوں میں طواف وداع کرسکتا ہے۔

اس طواف کا کفارہ اسی طرح ادا کیا جائے گا جیسے کہ دیگر ارکان حج میں کوئی غلطی ہونے پر یا چھوٹ جانے پر یعنی ہر رکن پر ایک بکرے کی قربانی جس کا گوشت حدود حرم میں موجود محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم ہوگا۔ نہ کفارہ ادا کرنے والا شخص اور نہ ہی اس کے گھر کا فرد اس کا کوئی حصہ اپنے استعمال میں لائے گا۔ ہر حج کے لئے ایک قربانی لازمی ہے۔ یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ اگر کوئی عورت حالت ایام میں ہو اور اس کے ساتھ حج پر گئے لوگ واپسی کی تیاری میں ہوں تو وہ بغیر طواف وداع کئے ان کے ساتھ واپس ہوسکتی ہے۔ اس پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا۔

سوال: ــــ ایک قصبے میں جس کی آبادی تیس ہزار سے زائد ہے اور جہاں پندرہ مسجدیں ہیں وہاں کی عام روایت کے مطابق لوگ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ہی ادا کرتے ہیں۔ کیا اس طریقہ کار کی پابندی ضروری ہے یا لوگوں کی آسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے نماز جمعہ کئی مساجد میں ہوسکتی ہے؟

جواب: ــــ اگر قصبے کے لوگ آسانی سے یہ اہتمام کرسکتے ہوں کہ نماز جمعہ کسی ایک ہی مسجد میں ادا کی جائے جہاں تمام نمازی پہنچ سکیں اور سہولت سے نماز پڑھ لیں تو یہ بڑی اچھی بات ہوگی کیونکہ یہ اجتماعیت کا ایک بڑا مظاہرہ ہوگا۔ سب لوگ ایک قائد اور امام کا خطبہ سنیں گے لیکن اس میں بعض عملی دشواریاں بھی ہیں جن کی بناء پر ہمیشہ یہ اہتمام شاید ممکن نہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ اس سے ٹریفک جام اور لوگوں کے اپنے کاموں پر پہنچنے میں تاخیر جیسے مسائل کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ جب کوئی قصبہ یا گاؤں ترقی کے اس مرحلے کو پہنچ جائے کہ اس کے تمام باشندوں کا نماز کی غرض سے ایک مسجد میں جگہ پر جمع ہونے میں دشواری پیش آنے لگے تو نماز جمعہ کی دو یا اس سے زائد جگہوں پر ادائیگی وقت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مناسب ہے۔ حالات کا جائزہ لے کر طریقہ کار کا تعین بستی کے سنجیدہ فکر رکھنے والے افراد خود کرسکتے ہیں۔

روشن خیال طبقہ جنس شناسی کی قبل از وقت تعلیم کے نقصانات سے چشم پوشی کر رہا ہے

اسلام کم عمری میں جنسی تعلیم کی اجازت ہرگز نہیں دیتا

تحریر: س۔ احمد

ہم گزشتہ اشاعتوں میں تعمیر سیرت یا شخصیت سازی کے موضوع پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کرتے رہے ہیں اور ساری بحث کے پیچھے یہ خیال کارفرما رہا ہے کہ انسانی سیرت اور خصوصا ایک مسلمان کی سیرت و شخصیت ایسی نہیں ہوتی جس کی تعمیر و تشکیل خلاء میں ہو جائے۔ یعنی اس کے جو لوازم ہیں انہیں ترک کردیا جائے اور یہ امید رکھی جائے کہ سیرت کی تو تعمیر ہوتی ہے، تخریب کا کہیں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جب کہ بصورت دیگر تخریب کا خطرہ قدم قدم پر موجود رہتا ہے۔ جس رویے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے وہ دراصل ایک کھلنڈرانہ رجحان ہے جو سائنسی اور مادی ترقی اور زندگی کی مسلمہ اقدار کے درمیان عدم توازن سے پیدا ہوا ہے۔ یہ رجحان ہمیں آج زندگی کے ہر مظہر کو علت و معلول کی روشنی میں پرکھنے پر اکساتا ہے اور ہر بات کا بصری ثبوت مانگتا ہے۔ اسی طرز فکر نے کہیں ہرزہ سرائی اور لایعنی بکواس کو آزادی تقریر، کہیں عریانیت اور فحاشی کو انفرادی آزادی اور حقوق نسواں کی حمایت کا نام دیا ہے۔

اسی رجحان کا کرشمہ ہے کہ آج ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا ہے جو اس خیال کی پرزور تائید کررہا ہے۔ اسکولوں میں طلباء و طالبات کو جنسی تعلیم دینا ضروری ہے اور جنس کے رموز سے ناواقف رکھنا ان پر علم کے ایک اہم دروازے کو بند کرنا ہے جس کا ان کی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ ایسی بہت سی جبلتیں ہیں جن کا انسانی زندگی سے براہ راست تعلق ہے لیکن اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے کہ ضروریات اور خواہشات کی درجہ بندی کا عمل تو انسانی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ جس جبلت کا آئندہ کسی مرحلے پر انسانی زندگی سے براہ راست تعلق ہونے والا ہے اسے ایسے وقت میں کیوں ابھارا جائے جب وہ ابھی کئی تہوں میں چھپی ہوئی ہے۔ سائنس ٹیکنولوجی اور کمیونیکیشن کی بے پناہ ترقی نے جن لوگوں کے ذہنوں کو بہت زیادہ منور کردیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس سے طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ ہوگا وہ اپنے باڈی سسٹم اور اس کے تحفظ کے بارے میں بہت کچھ سیکھیں گے۔ ان روشن خیالوں کی منطق اور منصوبے کے مطابق آٹھ سے دس کی عمر کے بچے اور بچیاں مبادیات جنس سے واقف ہوجائیں گی۔

اس سلسلے میں اسلام کا موقف یکسر مختلف ہے وہ اس دلیل کو کسی بھی طرح قابل اعتنا نہیں گرداننا۔ اسلام نہ صرف کم عمری میں جنسی تعلیم کا مخالف ہے بلکہ بچوں کی نظر سے ایسی عبارتوں کو گذارنے کے حق میں بھی نہیں ہے جن میں جنس کا کہیں سے ذکر ہو۔ جس طرح اساتذہ بچوں کو جنس کے بارے میں واقفیت پیدا کرنے کا درس دیں گے اور ظاہر ہے کہ بچے حتی الوسع اس پر عمل کریں گے اسی طرح اسلام کے موقف کے مطابق یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایسے کسی عمل، گفتگو، یا عبارت پر نظر نہ ڈالنے کی انہیں تلقین کی جائے جس سے ان کا اخلاق بگڑتا ہو۔ کیا آپ سمجھتے ہیں بچے اس ہدایت پر عمل نہیں کریں گے۔ سوال بس اس کا ہے کہ انہیں کون سی راہ دکھائی جائے۔ ناپختہ عمر میں غیر مطلوب جنس شناسی کی یا جنس سے چشم پوشی کی؟

کسی بھی ذمہ دار شخص کا ذہن جنسی تعلیم کے قبیح اثرات کو نعمت کے طور پر قبول کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ اور وہ یہی کہے گا اس طرح کی تعلیم لامحالہ فحاشی کی تربیت دے گی، حیا شرم سرے سے اٹھ جائے گی اور جنس کو کھیل تفریح کی کوئی چیز سمجھنے کے رجحان کو ہوا دے گی۔ اور جب ایسا ہوجائے گا تو کیا آپ کو خوش فہمی ہے کہ روئے زمین پر زندگی کا یہی رنگ رہے گا۔ جی نہیں بلکہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی زندگی کی سرگرمی کا وقفہ مختصر ہوجائے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہ بات ہمارے قارئین کی سمجھ میں نہ آئے۔ اپنے عینی مشاہدے کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی بار آور جنسی زندگی کا آغاز بیس سے ۲۵ سال کی عمر سے شروع ہوکر ۵۰ اور ۵۵ سال تک جاری رہتا ہے۔ اگر اس عمل کو پیچھے کی طرف لوٹا کر آٹھ اور دس سال کی عمر سے آپ شروع کرادیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چالیس سال کے اندر جسم کی قوت، کام کرنے کا حوصلہ اور زندگی کو سنوارنے کی آرزو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد باقی کیا رہا۔ صرف موت کا انتظار۔ اس ممکنہ صورت حال کو پیش نظر رکھیے اور فطرت کی تسخیر کے بلند بانگ دعووں پر نگاہ ڈالئے جن میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے موت کو شکست دی ہے۔ جب زندگی کے ایک گوشے پر فطرت کے ضابطے اور اسلام کے اختیار کردہ آئین سے انحراف کے نتیجے میں ہم خود کو موت سے قریب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کیا دلدادگان مغرب کے دعوے ہمیں کھوکھلے نہیں لگتے

> انسان کی بار آور جنسی زندگی کا آغاز بیس سے ۲۵ سال کی عمر سے شروع ہوکر ۵۰ اور ۵۵ سال تک جاری رہتا ہے۔ اگر اس عمل کو پیچھے کی طرف لوٹا کر آٹھ اور دس سال کی عمر سے آپ شروع کرادیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چالیس سال کے اندر جسم کی قوت، کام کرنے کا حوصلہ اور زندگی کو سنوارنے کی آرزو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد باقی کیا رہا۔ صرف موت کا انتظار۔

حج کے لئے کسی کی اجازت تو درکار نہیں ہے مگر شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال: میں جدہ کی ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ میں حج کرنا چاہوں تو کیا مجھے کمپنی سے اجازت لینی ہوگی۔ اگر کمپنی اجازت نہ دے اور پھر بھی میں حج کے لئے چلاجاؤں تو کیسا رہے گا۔ کیا حج مقبول سمجھا جائے گا۔

جواب: حج اللہ کے بندوں پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے کسی شخص کی اجازت ضروری نہیں۔ اور نہ ہی کسی شخص کو چاہئے کہ وہ بغیر معقول سبب کے اس فرض کی ادائیگی سے کسی کو روکے۔

ایک صورت حال یہ ہو سکتی ہے کہ بعض خدمات کے میدان میں ورکر کو ۲۴ گھنٹے کی ڈیوٹی انجام دینی ہوتی ہے اگر کوئی اس طرح کی خدمت پر مامور ہے تو اسے کام سے غیر حاضر رہنے کے لئے خصوصی اجازت درکار ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ کمپنی کا مالک ایام حج میں اپنے اسٹاف کی حاضری کمپنی میں ضروری سمجھتا ہو۔ اگر ایسا ہو تو ورکر کو اپنے معاہدہ عمل کی شرائط کی پوری پابندی کرنی چاہئے۔ مالک کو چاہئے کہ ایسی سہولتیں اپنے ملازمین کو دے کہ انہیں حج کرنے کا موقع مل جائے۔

فقہی سوالات

سوال: کوئی شخص دہلی کے کسی علاقے میں مقیم ہے اور وہاں سے تیس کلومیٹر کی دوری پر واقع کسی جگہ پر جاتا ہے تو وہاں رہنے کے دوران اسے قصر نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ نمازیں کن حالات میں قصر پڑھی جاسکتی ہیں یہ بھی بتائیں۔؟

جواب: نماز قصر کرنے میں جس پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہے وہ ہے سفر نہ کہ فاصلہ۔ زیادہ تر علماء کے نزدیک ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے عمل کو سفر کا درجہ دینے میں اس کے تئیں مقامی لوگوں کے رویے کو بڑا دخل ہے۔ یعنی غور طلب بات یہ ہے کہ جدید تر ذرائع مواصلات اور آمدورفت کے عام ہونے سے پہلے سفر کے سلسلے میں لوگوں کا کیا تصور یا رجحان تھا۔ مثال کے طور پر پچاس سال پہلے اگر دہلی کے لوگ فرید آباد جاتے ہوئے سفر کا اہتمام کرتے رہے ہوں تو ایسی صورت میں وہاں پر انہیں قصر نماز ادا کرنے کی اجازت تھی۔ انسانی زندگی کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ جو کام دس بیس سال پہلے بہت دشوار اور دیر طلب تھے وہ اتنے ہی آسان اور بہت ہی کم وقت میں ہونے لگے ہیں۔ مذکورہ حالت میں تیس میل جانا اور آنا اتنا آسان ہوگیا ہے کہ آپ کسی کو اپنے انتظار میں گھر پر بیٹھا بھی سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی آمدورفت سفر کے زمرے میں نہیں آئے گی اور نماز قصر کرنے کی اجازت حالت سفر میں ہی ہے اور وہ بھی عارضی طور پر جب آدمی تجارت یا کسی اور کام سے اپنے مستقر سے باہر مقیم ہو۔ اگر اس قیام کی مدت طویل ہوتی ہے تو نماز عام معمول کے مطابق پڑھی جائے گی اور قصر کی رخصت ختم ہوجائے گی۔

سوال: اگر کسی نے عیدالاضحی کے پہلے یا دوسرے دن طواف وداع کرلیا تو کیا اسے اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ کیا حج کے جن جن موقعوں پر یہ غلطی ہوگی اس کا الگ الگ کفارہ عائد ہوگا یا صرف ایک کفارہ سب کے لئے کافی ہوگا۔؟

جواب: مکہ مکرمہ سے باہر بشمول جدہ و طائف، مقیم لوگوں کے لئے طواف وداع واجب ہے۔ یہ حج کا آخری رکن ہے جو مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت ادا کیا جاتا ہے جب کہ حاجی اپنا سامان باندھ کر واپسی کے سفر کے لئے تیار

باقی صفحہ ۱۶ پر

> حج اللہ کے بندوں پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی کے لئے کسی شخص کی اجازت ضروری نہیں۔ اور نہ ہی کسی شخص کو چاہئے کہ وہ بغیر معقول سبب کے اس فرض کی ادائیگی سے کسی کو روکے۔

زندگی کے غمناک مراحل سے مسکراتے ہوئے گزر جانے کا ایک تیر بہ ہدف نسخہ

ہنسی مذاق اور قہقہوں سے ذہنی تھکن اور تناؤ دور ہو جاتے ہیں

دفتروں اور کارخانوں اور اجتماعی زندگی کی مختلف حالتوں میں کون کب اور کس سے کس طرح کا مذاق کرتا ہے ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں جرمنی اور دیگر ممالک میں محققین انسانوں کے درمیان گفتگو کے تجربے کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم عبوری نتائج سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ عام سطح کا ہنسی مذاق لوگوں کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہاں اس کے برعکس ایسے چبھتے ہوئے فقرے جن کا روئے سخن کسی کی طرف ہو ان کا ضرور اہم کردار ہے۔ اس طرح سے جو ترسیل واقع ہوتی ہے وہ عام مذاق کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور بامعنی ہوتی ہے۔

مزاح کے نفسیاتی پہلو پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تھکے ہوئے ذہن کو راحت پہنچاتا ہے خواہ یہ تھکن کام کی ہو یا کسی دباؤ یا تشنج کی وجہ سے ہو۔ اکثر آپ نے دیکھا ہو گا کہ دفتر کے کسی ساتھی سے کوئی ایسی بات ہو جائے جو آپ کو گراں گذرے تو اس کا ذکر دوسرے ساتھی سے کر کے آپ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں لیکن اس سے بھی سنگین صورت حال اس وقت پیش آتی ہے جب دفتر کا سربراہ یا عہدے میں آپ سے کوئی بہت بڑا شخص کوئی ہتک آمیز بات کہے باز پرس کرے یا کسی کام پر حوصلہ افزائی کے بجائے افسری جتاتے ہوئے بخل سے کام لے کر آپ کے کیے دھرے پر پانی پھیر دے۔ آپ کے کارنامے کو اپنے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کرے تو ظاہر ہے کہ آپ کی کیا حالت ہوگی۔ یقینا آپ شدید ذہنی تشنج میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس تناؤ اور دباؤ سے نجات پانے کا بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ آپ اپنے بے تکلف دوستوں کے سامنے افسر موصوف کی حرکات و سکنات کی نقل کرتے ہوئے ان کے مکالمات دہرائیں ان کی کسی ذاتی کمزوری پر اظہار خیال کریں اور دوستوں کو اظہار خیال کی دعوت دیں۔ کچھ ہی دیر بعد آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کی ذہنی کیفیت پر اس کا تیزی سے اثر ہو رہا ہے۔ گویا مزاح کسی بھی آتش گیر صورت حال سے ہی بچنے کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کے غمناک کر دینے والے مراحل سے مسکراتے ہوئے گذر جانے کا وسیلہ بھی ہے۔ شاید اسی لئے شاعر نے جب گھبرا کر مر جانے کے اندیشے کا اظہار کیا تو یہ سوال قائم کر کے اس گھبراہٹ سے اس نے خود کو بچا بھی لیا کہ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔"

> مزاح کسی بھی آتش گیر صورت حال سے بچنے کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کے غمناک کر دینے والے مراحل سے مسکراتے ہوئے گذر جانے کا وسیلہ بھی ہے۔ شاید اسی لئے شاعر نے جب گھبرا کر مر جانے کے اندیشے کا اظہار کیا تو یہ سوال قائم کر کے اس گھبراہٹ سے اس نے خود کو بچا لیا کہ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

۱۹۶۰ میں کیے گئے ایک مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایسے نظام میں جس کے افراد ایک درجہ بندی کے ضابطے کے پابند ہوں مثلاً ڈائرکٹر، منیجر، سپروائزر، کلرک، چپراسی وغیرہ اس میں افراد کے درمیان طنز و مزاح کا سلسلہ اوپر سے نیچے کی ترتیب میں چلتا ہے۔ اونچے عہدے پر فائز افراد اپنے سے نیچے منصب کے لوگوں کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں یہاں تک کہ یہ روایت درجہ بدرجہ نچلے منصبوں تک چلتی رہتی ہے۔ تقریباً دنیا میں ہر جگہ مذاق کی نفسیات یہی ہے۔ شاید زمانے کے اتنی ترقی کر لینے کے بعد بھی ایسا نہیں ہو پایا ہے کہ منصب میں کمتر لوگ اپنے سربراہ یا بزرگ کا مذاق اڑائیں۔

ایک ساتھ بیٹھے ہوئے چار چھ افراد کے درمیان ہنسی مذاق چل رہا ہو تو اس گفتگو سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ منصب و مقام میں کون برتر ہے اور کون کمتر۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے اگر اس گروہ میں مرد اور عورتیں دونوں موجود ہیں تو باعتبار صنف اس مجلس مزاح میں کس کا کیا رول رہتا ہے یہ جاننا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اگر مالک یا دفتر کا سربراہ کوئی مذاق کرتا ہے تو سب اس پر فرض منصبی سمجھ کر ہنستے ہیں چاہے وہ مذاق اتنا پھیکا ہو کہ سنانے والے سے وضاحت طلب کرنے کی نوبت آجائے کہ "میر صاحب ہم اس لطیفے میں ہنسیں کہاں پر" اس کے برعکس بعض منصب میں برتر لوگ اپنے ماتحتوں کی طرف سے سنائے گئے لطیفے پر مالکانہ شان بے نیازی اور سرپرستی کے انداز میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور ماتحت بیچارا خفیف سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس کا فرق بھی بہت پڑتا ہے کہ مذاق کرنے والا عورت ہے یا مرد۔ تقریباً ہر معاشرہ میں مزاح کے تئیں عورتوں اور مردوں کے رویوں کا تجزیہ مختلف سطحوں پر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی عوت بلند آواز میں کوئی ہنسی کی بات کہی اور زور شور سے قہقہے لگائے تو آس پاس موجود مرد دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہیں گے کیونکہ یہ عورتوں کے لیے متعینہ آداب کے خلاف ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں نوجوان لڑکیوں کے رویے میں خاصا فرق ہے تاہم لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان مذاق کرنے اور اس کے تئیں ان کے رد عمل میں فرق پھر بھی باقی رہے گا۔ اس صنفی فرق کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہنسنا اور مذاق کرنا ذہنی تناؤ دور کرنے کا ایک ایسا مؤثر ذریعہ ہے جس کا مقابلہ کوئی دوا نہیں کر سکتا اور بلاتفریق جنس، عمر، منصب اور سماجی حیثیت کے ہر انسان کی اہم ضرورت ہے۔
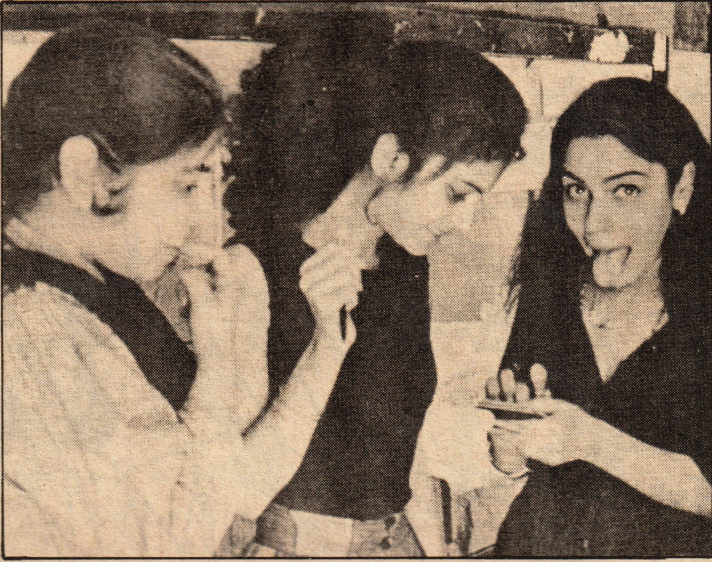
کٹے ہونٹ اور تالو سے چپکی زبان کے آپریشن کا صد فی صد کامیاب طریقہ

اے پی شی ڈنٹل کالج منگلور سے پوسٹ گریجویٹ ڈگری حاصل کرنے والے ۳۰ سالہ ڈاکٹر مصطفی کو اس وقت ملک کے مصروف ترین ڈاکٹروں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو کسی مالی منفعت کے لالچ کے بغیر مایوس اور پریشان مریضوں کی خدمت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ صبح سے رات کو دو بجے تک کسی بچے کے کٹے ہوئے ہونٹ کی پیوند کاری نیز دیگر آپریشنوں سے فارغ ہو کر آپریشن تھیٹر سے بھوکے پیاسے نکلے ہیں کہ ہاتھ دھونے کے ہی دوران ایمرجنسی کیس آجاتا ہے وہ بھی ایسے شخص کا کہ اس کے چہرے پر اتنا لمبا زخم لگا ہے کہ اس کی پلیٹ میں ایک کان کا آدھا حصہ بھی آگیا ہے۔ پیشے سے وفاداری انھیں مجبور کرتی ہے کہ آپریشن تھیٹر میں واپس چلے جائیں اور وہ پھر مصروف ہو گئے۔ وہ میکسیلو فیشیئل سرجن ہیں اور سرجری کی اس برانچ کے ماہر جو عام ڈاکٹر کے بس کی نہیں۔ اپنی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے دوران کٹے ہونٹ درست کرتے وقت انھوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ یہ آپریشن زیادہ تر کاسمیٹک نوعیت کے تھے اور آپریشن کرنے والے ڈاکٹر اس فن کی پوری نزاکتوں سے واقف نہیں ہوتے اس لیے بدشکل ہونٹ یا تالو سے چپکی ہوئی زبان آپریشن کے بعد صحیح طور پر اپنا عمل انجام دینے سے یا تو قاصر رہتی ہیں یا ان کے فعل میں کوئی نقص رہ جاتا ہے۔ اس وقت ہونٹ اور زبان کے فعل کو درست کرنے کے لئے بروئے کار لائی جانے والی سرجری کے طریقوں میں جو مقبول ترین طریقہ ہے اسے میلارڈ تکنیک کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ڈاکٹر مصطفی ایک ایسی جدید تکنیک کے قائل ہیں جو اس وقت فرانس، برطانیہ اور ہانگ کانگ میں زیر عمل ہے۔ اس طریقے کو ڈی لائر تکنیک کہتے ہیں۔ اس سے ہونٹ اور تالو کے عمل کو پوری طرح بحال کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر مصطفی اس تکنیک سے ۱۹۹۳ میں دھارواڑ میں منعقد ایک ورکشاپ میں واقف ہوئے جس میں ایک برطانوی ماہر ٹونی مارکوئیز نے شرکت کی تھی اور جنھوں نے اس تکنیک کا وہاں عملی مظاہرہ کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے ہانگ کانگ کے ایک ڈاکٹر بنسل سمان کے ساتھ بنگلور میں انھی خطوط پر کام کیا۔ ابھی تک ہونٹ اور زبان کے فعل کو بحال کرنے کے جتنے طریقے سامنے آئے ہیں ان میں سے کسی کی صد فی صد کامیابی کے بارے میں ضمانت نہیں دی جا سکتی لیکن ڈاکٹر مصطفی کے اختیار کردہ طریقہ جراحی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کامیاب ترین طریقہ ہے۔

آپریشن کے بعد ——— آپریشن سے پہلے

ڈاکٹر مصطفی نادار مریضوں کے لئے فرشتہ رحمت

مصطفی صاحب کو عملی میدان میں قدم رکھنے کے بعد بہت جلد پتہ چل گیا کہ ہونٹ اور زبان کے ناقص فعل سے متاثر زیادہ تر غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہی ہوتے ہیں جن کے پاس کرکٹو سرجری کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے پیسے نہیں کہ کہاں سے جب کہ ان میں بڑی تعداد روزانہ دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے کما پاتی ہے۔ پہلے تو انھوں نے اپنی آپریشن فیس کی شرح ختم کی لیکن جب ان پر یہ بات کھلی کہ جو افراد ان کے پاس آتے تھے ان کے خاندان اسپتال کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تو انھوں نے اپنے بعض رفقاء کار سے مشورہ کیا اور اس سلسلے میں ان کی مدد طلب کی۔ ان کے ساتھی نادار مریضوں کی مدد پر تیار ہوئے اور مفت آپریشن کرنے لگے۔ اس کے لیے انھوں نے ایسے مفت کیمپوں کا اہتمام کیا جس کے بعض مصارف مخیر اور تجارت پیشہ افراد برداشت کرلیں۔ اس کام میں انھیں دقتیں بھی پیش آئیں مثلاً یہ کہ منگلور کے اسپتال نے انھیں اپنا آپریشن تھیٹر مفت دینے سے انکار کر دیا مصطفی صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ انھیں اس وقت خاصی مدد ملی جب انھوں نے تاجروں کے نام ایک اپیل شائع کی اور پھر عطیات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج ان کے ساتھ ماہر اور فرض شناس ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ہے جن کا تعلق میڈیکل سائنس کی مختلف شاخوں سے ہے جن کی ضرورت ہونٹ اور زبان کے آپریشن میں پڑتی ہے۔

ایسا مریض جس کی زبان اور تالو پوری طرح اپنا عمل انجام نہیں دیتے انہیں نوالہ نگلنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ پریشانی اسے بولنے میں ہوتی ہے۔ ایسے افراد کو سمعی امراض بھی لاحق ہو جاتے ہیں جس کا سبب تالو کے خلا میں پھنس جانے والی غذا کے ذرات ہوتے ہیں۔ ڈی لائر تکنیک کی مدد سے سرجن زبان کے مڑے ہوئے حصے کو درست کرتا ہے۔

> ابھی تک ہونٹ اور زبان کے فعل کو بحال کرنے کے جتنے طریقے سامنے آئے ہیں ان میں سے کسی کی صد فیصد کامیابی کے بارے میں ضمانت نہیں دی جا سکتی لیکن ڈاکٹر مصطفی کے اختیار کردہ طریقہ جراحی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کامیاب ترین طریقہ ہے۔

نئی کتاب

اسلامی طریقہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو مرض الموت وبائی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے

ایڈز اور جنسی امراض سے بچنے اور ان کے علاج کے اسلامی اصول بتانے والی ایک کار آمد کتاب

ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔ تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہو گا۔

نام کتاب:۔ اسلامک ماڈلز فار کنٹرول آف ایڈز
(ایڈز کی روک تھام کے اسلامی طریقے)
مصنف:۔ ڈاکٹر جاوید جمیل
ناشر:۔ مشن پبلی کیشنز، قاضی اسٹریٹ، سہارنپور (یوپی)
صفحات:۔ ۱۲۰ قیمت:۔ ۳۵ روپے
مبصر:۔ س۔ احمد

زیر نظر کتاب میں ایڈز سے متعلق ضروری معلومات اور حقائق، متاثر افراد کے عالمی اعداد و شمار اور اس کی روک تھام کے مروج مغربی طریقوں کے حوالے سے جنس کی حقیقت و اہمیت، صحت کی اہمیت، اسلام کا تصور جنس اور اس کی تسکین کے جائز طریقوں کے نتائج کا مغرب کے اختیار کردہ معیارات سے موازنہ کیا گیا ہے۔

طبی سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچادینے والے مرض کا تعلق جتنا طب سے ہے اتنا ہی تہذیب و معاشرے سے بھی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ ایسے طور طریقے اختیار کرے گا جہاں مقررہ حدود سے کھلے عام انحراف و تجاوز ہونے لگے گا تو یہی ہلاکت خیز صورت حال سامنے آئے گی جس کا سامنا آج مغرب انسانیت کو تباہی سے بچانے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کررہا ہے۔

اس کتاب میں کئی ابواب مثلاً اسلام میں صحت کی اہمیت، اسلام میں رشتہ ازدواج اور اس کی حرمت، جنسی صفائی و ستھرائی، لوطی کا انجام، اور ایڈز کی روک تھام کے اسلامی طریقے ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہو گا کہ اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کا درجہ نہ دینے کا مغربی مزاج

> سوچنے کی بات ہے کہ ایک حیوانی جبلت کو اسلام نے منضبط کرکے اس میں نسل انسانی کی فلاح کا کیسا پہلو پیدا کردیا کہ وہی ضبط کا ایک حجاب جہاں درمیان سے اٹھ جاتا ہے وہیں مرض الموت یا ایڈز وبائی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے۔

سراسر تعصب پر مبنی ہے۔ آج جس طرح اسلام کے ساتھ بنیاد پرستی کو جوڑ دیا گیا ہے اسی طرح مغرب نے مسلمانوں کو تقدیر پرست کے تعصب سے بھی نوازا ہے۔

لیکن ایک پہلو کی طرف سے آنکھ پھیرلی کہ اسلام نے تقدیر پر راضی رہ کر تدبیر پر اعتماد کرنے کا درس بھی دیا ہے جس کی مثال صحت کی حفاظت کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا بھی بنائی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امراض کے علاج کے سلسلے میں بحث و تحقیق کی حوصلہ شکنی اسلام کسی طرح نہیں کرتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت و حیات کے معاملات خدا کے اختیار سے (نعوذ باللہ) نکل جائیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان لوگوں کے سامنے چودہ سو سال پہلے آیا تھا جب انسانوں کا عام عقیدہ تھا کہ کوئی بھی مرض آسمان سے نازل ہونے والی بلا ہوتا ہے اور اس کا علاج دیوی دیوتاؤں کو نذر گذار کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب اسلام مرض کے علاج کی حوصلہ افزائی کررہا ہے بلکہ اس سے غفلت برتنے کو گناہ کا درجہ دے رہا ہے تو ظاہر ہے کہ امراض سے دور رہنے کے لئے اور انسانی جسم کی صحیح کارکردگی کے لیے وہ بعض افعال و حرکات اور عادات سے روکے گا بھی مثلاً شراب نہ پیو، خنزیر اور کتا مت کھاؤ، لواطت اور جنسی بے راہ روی مت اختیار کرو وغیرہ۔

اسلام میں جنس کے تصور سے مصنف نے بہت مدلل بحث کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام جنس کو پیاس اور بھوک کے بعد انسانی جسم کے لیے تیسری ضرورت قرار دیتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جس طرح اس نے آداب اکل و شرب متعین کیے ہیں اور ان سے تجاوز پر تنبیہہ کی ہے اسی طرح اس تیسری ضرورت کی تکمیل کے بھی آداب، عمر اور حالات متعین کیے ہیں جن سے انحراف کا نتیجہ بربادی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ اس ضمن میں زن و شوہر کے درمیان باہمی کشش، محبت پانے اور محبت دینے کے جذبہ پر خاص طور پر تاکید کی ہے۔ اس کے برعکس مغربیت ہے جو آج پوری طرح مادیت کے تلے دبی ہوئی ہے اور حقوق انسانی، شخصی آزادی اور آزادی نسواں جیسے کھوکھلے نعروں پر زندہ ہے۔ ان تمام عوامل کو مصنف نے بجا طور پر ہدف تنقید بنایا ہے

جنسی طور پر لگنے والی بیماریوں سے تحفظ کے باب میں شادی کے سماجی ادارے کو محفوظ رکھنے کی طرف جاوید جمیل صاحب نے جس طرح ذہنوں کو متوجہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک حیوانی جبلت کو اسلام نے منضبط کرکے اس میں نسل انسانی کی فلاح کا کیسا پہلو پیدا کردیا کہ وہی ضبط کا ایک حجاب جہاں درمیان سے اٹھ جاتا ہے وہیں مرض الموت یا ایڈز وبائی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے۔

کنگ جارج میڈیکل کالج کے سند یافتہ مصنف جو سنٹر برائے اپلائیڈ اسٹڈیز آف اسلام کے ڈائرکٹر بھی ہیں پیشے سے طبیب ہیں۔ ادبی، طبی اور سماجی موضوعات پر ان کی تحریریں ملک اور بیرون ملک علم داں حلقوں سے داد پاتی رہی ہیں۔

آپ کی الجھنیں

اس نے پندرہ سال کا عرصہ عمر قید کی مانند کاٹ دیا اور آپ نے اسے بیوی ہی نہیں سمجھا

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہو گیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

سوال:۔ میں ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد گھر والوں نے میری شادی کی بات چلائی تو میں نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ لڑکی تعلیم یافتہ اور خوبصورت ہونی چاہیے۔ لیکن گھر کے افراد میں نہ جانے کیا طے پایا کہ میرے والد اور نانا نے ایک لڑکی کو دیکھے بغیر ہی اس سے میرا رشتہ پکا کردیا۔ میرے احتجاج کرنے پر یہ جواب ملا کہ لڑکی بہت خوبصورت اور تعلیم یافتہ ہے اور یہ کہ اس سے شادی کرکے میرا مستقبل سنور جائے گا۔ میں نے بزرگوں کی بات پر یقین کرلیا اور نکاح ہو گیا لیکن جب پہلی بار بیوی پر نظر ڈالی تو مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی کیونکہ وہ بے حد کالی اور بد صورتی کا مجسمہ تھی۔ کسی سے میں نے شکایت نہیں کی اور یہ سوچ لیا کہ کسی مصلحت کے تحت مجھے قربان کیا گیا ہے۔ میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا لیکن میرے ارادے کا علم ماں کو ہو گیا اور انھوں نے گھر کی عزت اور مہمانوں کی موجودگی کا واسطہ دے کر ایسا کرنے سے باز رکھا۔ میری بیوی بد صورت تو تھی ہی جاہل اور گنوار بھی تھی جسے اپنا نام بھی لکھنا نہیں آتا۔ شادی کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ میرے سسر حد درجہ چالاک قسم کے آدمی ہیں اور دراصل انھوں نے میرے والد اور نانا کی حد درجہ شرافت اور سادگی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنی سحر انگیز باتوں کے جال میں ایسا پھنسایا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے۔

شادی کو پندرہ سال ہونے پر بھی میں بیوی کو بیوی کا درجہ نہیں دے سکا اس کی حیثیت ہمارے گھر میں نوکرانی کی سی ہے۔ میری والدہ کا اس غم میں انتقال ہو گیا ہے۔ میں خود ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں اور باعزت و خوشحال زندگی گذار رہا ہوں۔ والد ضعیف اور معاملات زندگی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ دوسری شادی کرنے کا ارادہ میں نے بہت کیا لیکن والد نے خاندانی عزت کا واسطہ دے کر اس سے روک دیا کہ ہماری سات پشتوں میں ایسا کسی نے نہیں کیا۔ نہ کسی نے دوسری شادی کی نہ طلاق دی۔ میری بیوی گھر میں رہتی ہے لیکن میں اس کی صورت تک دیکھنے کا روا دار نہیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے گناہوں کی طرف قدم بڑھادیے اور اب میں ہر طرح سے گناہوں کی دلدل میں ڈوب چکا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ اگر میرے گناہوں کا پردہ فاش ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اب میری عمر ۴۵ سال کی ہو چکی ہے لیکن دولت، شہرت اور عزت سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود میں زندگی کی راہ پر یکہ و تنہا ہوں۔ ایسی صورت میں آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ (ایک طویل خط کی تلخیص)

س۔ ا۔ صدیقی (فرضی نام)

جواب:۔ برادر صدیقی صاحب!

ہم پر اعتماد کرنے اور مشورہ طلب کرنے کا شکریہ۔ یقین جانئے ہمیں آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن محض ہمدردی کرکے رہ جانا اور آپ کی خامیوں کا احساس نہ دلانا آپ سے دشمنی کے مترادف ہو گا۔ عزت، دولت، شہرت سب کچھ آپ کے پاس ہے جس کا بیشتر حصہ غالباً خاندان اور گھر سے ہی آپ کو منتقل ہوا ہو گا۔ ذلت سے بھی آپ کا دامن بھر چکا ہے۔ جو نتیجہ ہے بیوی سے حد درجہ بے رحمانہ اور غیر انسانی سلوک کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ذلت آمیز پہلو سے لوگ واقف ابھی نہیں ہوئے ہیں اور اس خیال سے آپ مضطرب ہیں کہ لوگوں کو اصلیت معلوم ہوگی تو آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس سے پہلے کہ آپ آنکھ تک گناہوں کی دلدل میں دھنس جائیں آپ اپنا محاسبہ کیجئے جو شاید آپ نے آج تک کبھی نہ کیا ہو گا۔

والدین، نانا اور بہنوں کی طرف سے خاندان کی عزت و آبرو کا واسطہ دئے جانے پر بقول خود حد درجہ بد صورت اور ناخواندہ و بد سلیقہ عورت کو بیوی کی حیثیت سے محروم کرکے اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اپنے گھر والوں سے انتقام لیا ہے تو یہ آپ کی نادانی ہے۔ آپ نے اس معاملے میں خاصا تاجرانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ جن بزرگوں نے آپ کو شادی کے لئے اور اس کے بعد کئی باتیں ماننے پر مجبور کیا اگر ان کے مقابلے پر اتر آتے تو زمین جائداد سے محروم ہونا پڑتا۔ لہذا کمزور ترین حریف آپ کو اس عورت میں نظر آیا جو اللہ اور اس کی شریعت اور سماجی قانون کی رو سے ہر طرح آپ کی بیوی تھی لیکن آپ نے کبھی اسے بیوی نہ سمجھا۔

پندرہ سال کا عرصہ عمر قید سے بھی زیادہ ہے جو اس عورت نے آپ کے گھر کی چہار دیواری میں نوکرانی کی حیثیت سے کاٹ دیے۔ آپ نے اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا جو پندرہ سال تک دی ہے اور اس کی آہ نے آپ کو بظاہر عزت دار ہوتے ہوئے اپنی نگاہ میں بے عزت کردیا ہے کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ اپنی زیادتیوں سے توبہ کرلیں اور اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو اس کا جائز مقام دیدیں۔ زندگی کے اس موڑ پر اب وہی آپ کے لئے بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔

Price Rs. 5/-
16 - 30 April 1996
Volume : 3, Issue : 8

The Milli Times International
49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018
Fax: (011) 6926030

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-11234/96

پھر سوئے حرم لے چل

لاکھوں کا مجمع انتہائی نظم و ضبط، خشوع و خضوع، توجہ وانہماک اور ذوق و شوق سے بیت اللہ کے طواف میں مصروف ہے۔ اس عبادت گزار بھیڑ میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی، سیاہ بھی ہیں اور سفید بھی۔ کوئی مشرق سے آیا ہے تو کوئی مغرب سے، کوئی شمال سے تو کوئی جنوب سے۔ ترسیل خیالات کے لئے سب کی زبانیں مختلف اور سب کے لباس جدا ہیں۔ لیکن بارگاہ خدا میں یہ سارے امتیازات مٹ گئے ہیں۔ سب ایک ہی لباس میں ملبوس ہیں اور سب کی زبان پر ایک ہی کلمہ ہے، اللہ کی بڑائی کا کلمہ۔ اس ذات کی بڑائی کی بات جس کے سامنے سب کی بڑائیاں ہیچ ہیں۔ اس تصویر کو غور سے دیکھنے پر اس میں بہت سے معانی نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک بات پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ سب کے سر ایک خاص مرکز کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور نگاہوں میں بلاکی یکسوئی ہے۔ خدا کے گھر کے گرد گھومتے ہوئے سب کی نگاہوں کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور سب کے دلوں میں ایک ہی خواہش ہے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹنا ہے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کر کے اور نیکیوں کے خزانے سے جھولی بھر کے لوٹنا ہے۔
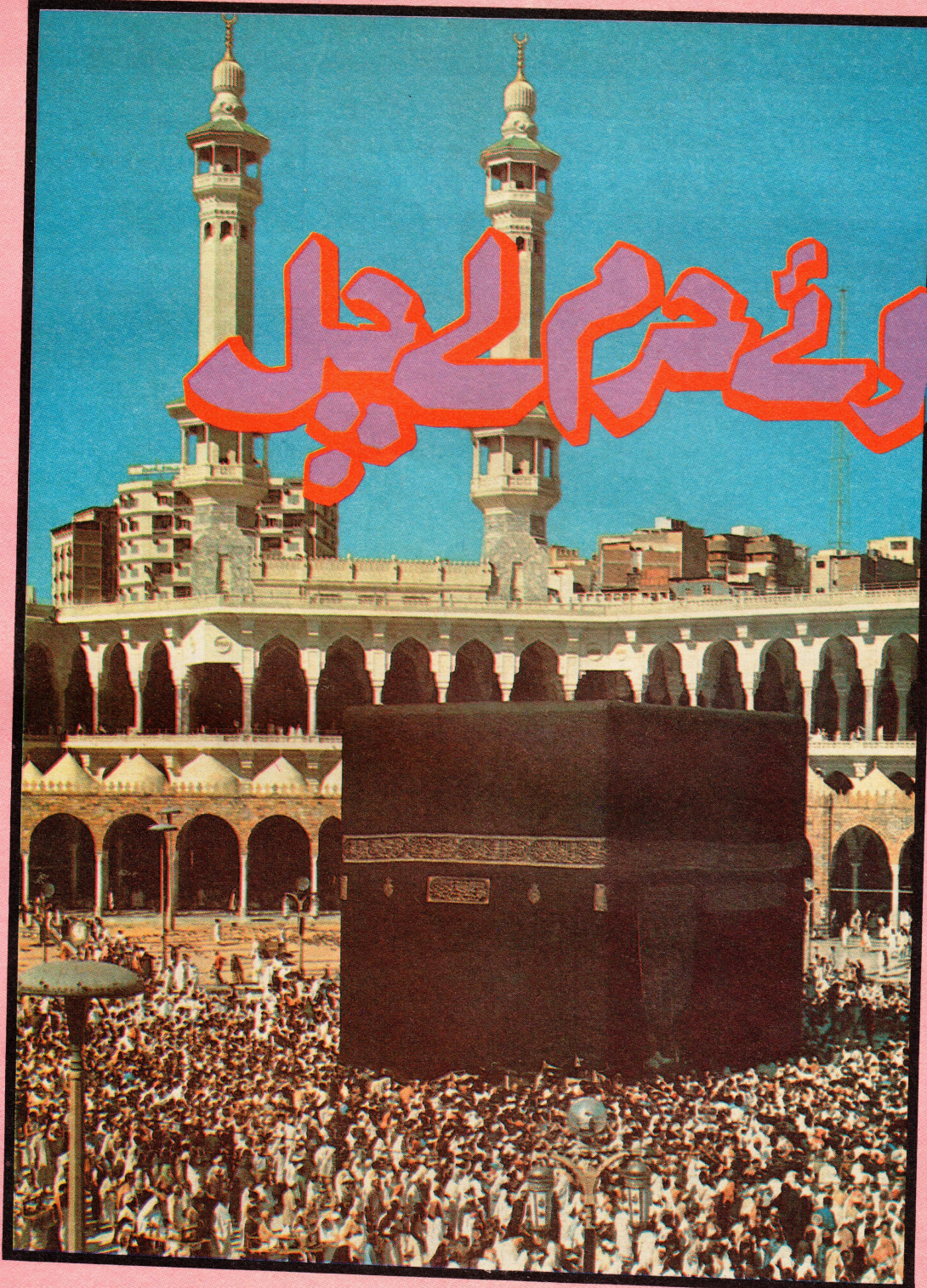
خدا کی خوشنودی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اور جہاں اس کے حصول کی امید ہو وہاں ذہن و دماغ کا یکسو ہو کر اسی نعمت کے مرکز پر آنکھیں جمادینا ہر بندے کی معراج ہے۔ زندگی کا حاصل ہے۔ انسان خواہشات کا مجموعہ ہے جن کی تکمیل کے لئے اس کے ذہن و دماغ وادی وادی بھٹکتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی دل میں ایک ہی خواہش جاگزیں ہو گئی ہو تو اس کی نگاہیں اسی ایک مرکز آرزو پر ٹک سی جاتی ہیں۔ یہی پرکشش منظر خانہ کعبہ کے طواف کے دوران نظر آتا ہے۔

ساری دنیا کے مسلمان بحیثیت مجموعی بھی اور اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں بھی نوع بہ نوع مسائل سے دو چار ہیں۔ سبھی قسم قسم کی خواہشات کے جالوں میں پھنسے ہوئے شوریدہ حال وادی وصحرا کی خاک چھان رہے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ ایک مقصد پر نگاہیں جمادینے کا سبق بھول گئے ہیں جس کی تلقین طواف کعبہ کے دوران ہوتی ہے۔ زندگی کے تمام اعمال میں خدا کی خوشنودی ہی وہ واحد مقصد اور مرکز ہے جس سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو بندھ جانا چاہئے کیونکہ اسی میں ان کی دنیوی و اخروی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ مگر بدقسمتی سے پاک خدا کی پاکی و بڑائی کا مقصد و مرکز جس پر تمام نگاہوں کو مرکوز رہنا تھا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ پر دنیاوی خواہشیں آگئی ہیں دنیاوی کامیابی کے نشے میں ہم نے آخری رسول کے احکامات کو فراموش کردیا ہے اور مرکز سے دور ہو کر منتشر ہوگئے ہیں اتحاد کی کمی نے ہمیں خود ہی اپنا دشمن بنادیا ہے اور ہم نے آخری رسول کی سنت کے دامن کو چھوڑ کر دنیاوی نیرنگیوں کے دامن میں پناہ ڈھونڈنا شروع کردیا ہے۔ نتیجہ سامنے ہے۔ آج مسلمانوں کے ساتھ وہی کچھ ہورہا ہے جو مرکز کھوجانے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ منزل کی سمت وسراغ کھودیتے اور شاہراہ مقصد سے بھٹک جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے کچھ بھٹکے ہوئے آہو پھر سوئے حرم آئے ہیں۔ دعا ہے پاک پرودگار سے کہ یہ بھٹکے ہوئے آہو طواف کعبہ سے اپنے مرکز و مقصد پر نگاہیں مرکوز کردینے کا سبق لیکر اپنے اپنے گھروں کو لوٹیں اور اس پیغام نجات و فلاح کو ساری دنیا کے مسلمانوں میں عام کردیں۔ ●